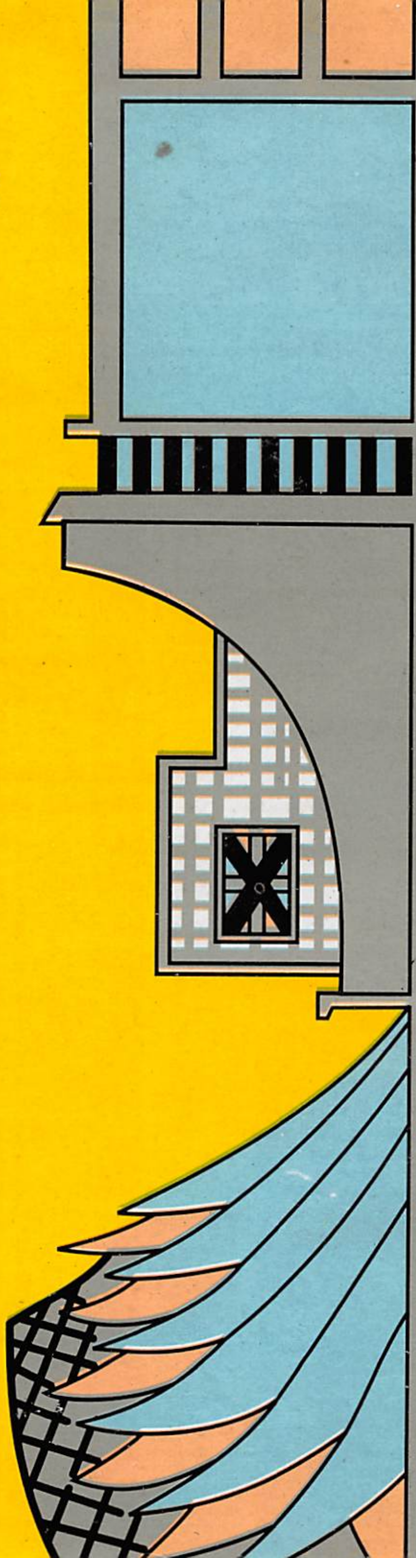
زندگی بے بندگی شرمندگی

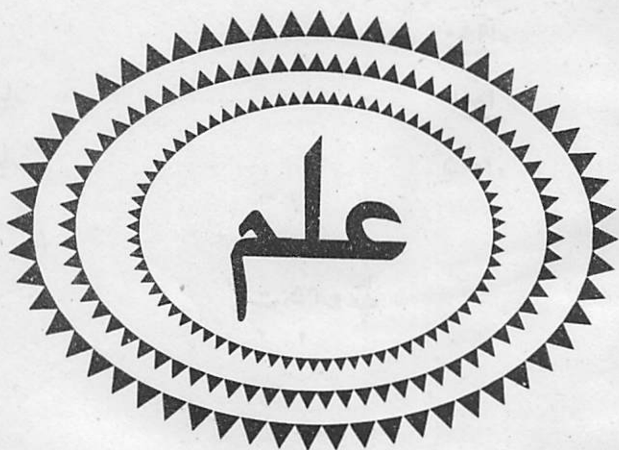
٨

علم

بنتُ الاسلام



زندگی بے بندگی شرمندگی : ۸



بنت الاسلام

ادارہ بتول ٥ سید پلازہ 30 ٥ فیروز پور روڈ ٥ لاہور



طابع وناشر	....	ادارہ بتول لاہور
مطبع	....	اے این اے پرنٹرز
پہلی بار	....	۱۹۸۰ء
تیرھویں بار	....	۲۰۰۱ء
سولہویں بار	....	۲۰۰۵ء

قیمت: ۴۵ روپے



ترتیب

ترتیب

(اشاعت علم کے طریقے)





فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

تعارف

یہ تالیف اپنے سلسلے کی آٹھویں کتاب ہے۔ اس سے پہلے مندرجہ ذیل موضوعات پر سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ آخرت

۲۔ حب الٰہی

۳۔ داعی کے اوصاف

۴۔ نفس کا تزکیہ

۵۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ

۶۔ صیامِ رمضان و حج بیت اللہ

۷۔ حقوق العباد

جب اس سلسلے کو شروع کیا گیا تھا تو آغاز ہی میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ ان کتب کے لیے جو موضوعات منتخب کیے گئے ہیں' وہ اس خیال سے چنے گئے ہیں کہ وہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً جس شخص کے دل میں آخرت کی جواب دہی کا احساس ہو گا' وہ ضرور کوشش کرے گا کہ زندگی میں برائیوں اور بد اعمالیوں سے بچے اور اس کا برائیوں اور بد اعمالیوں سے بچنا نوعِ انسانی کے دکھوں کو کم کرنے اور آرام و سہولت کو بڑھانے کا

باعث بنے گا۔

ایسے ہی جس کے دل میں خدا کی محبت اور خدا کا خوف موجود ہوگا' اس کا جذبہ محبت اور خوفِ خدا اسے خود بخود ہی اللہ کی پسندیدہ راہوں کی طرف چلاتا چلا جائے گا' بغیر اس کے کہ وہ ان راہوں کی طرف چلنے میں کوئی ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کرے۔

ایسے ہی جسے معلوم ہوگا کہ تبلیغِ دین کتنا بڑا صدقہ جاریہ ہے اور تبلیغ کرنے والے میں کن کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے جن کے بغیر وہ اس راہ پر زیادہ دور تک نہیں جا سکے گا۔ اس کے دل میں خود بخود ہی یہ خواہش پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے آپ کو ان اوصاف سے مزین کرے جو اسے ایک کامیاب مبلغ بنانے میں مدد دینے والے ہوں۔

اسی طرح جو اچھی طرح جان لے گا کہ برے اعمال صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی بربادی کا شکار بنا دیتے ہیں اور اپنے نفس کا تزکیہ کر کے وہ دنیوی اور اخروی' انفرادی اور اجتماعی ہر طرح کی کامیابی حاصل کر لے گا' اس سے آسانی کے ساتھ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ قلب کی آمادگی کے ساتھ برائی سے بچے گا اور دلی خوشی سے نیکی کی طرف متوجہ ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے جن چار عبادات کو اسلام کی عمارت کے ستون قرار دیا ہے' ان کے اصول وقواعد' اغراض ومقاصد اور خیر وبرکت کا علم ہو جانا انسان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ سمجھ بوجھ کر نہیں بلکہ دلی خوشی اور ذوق وشوق سے ان عبادات کو ادا کرے اور ان کی دینی اور دنیوی خیر وبرکت سے سرفراز ہو۔

پھر انسان ایک معاشرتی حیوان ہے جو تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت اور حقیر سے حقیر تمنا کو پورا کرنے کے لیے بھی اسے بے شمار دوسرے انسانوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو باہمی حقوق وفرائض کے

بندھن میں باندھ رکھا ہے تاکہ ہر شخص اپنا فرض ادا کرتے ہوئے دوسرے کی امداد کا ذریعہ بنتا چلا جائے۔ باہمی حقوق و فرائض کے اس نظام کی اہمیت' تاکید' فضیلت' مصالح اور خیر و برکت کو اچھی طرح جان لینا انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ آرام اور سہولت کے ساتھ دوسروں کی مدد کرتا اور دوسروں سے امداد لیتا رہے۔

ایسے ہی علم کا موضوع بھی بڑی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ جو شخص علم کی فضیلت کو جان لے گا اور جسے معلوم ہو گا کہ خدائے ذوالجلال اور اس کے برگزیدہ رسولؐ نے علم کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور مسلمان بزرگوں نے علم کے حصول اور علم کی اشاعت کی خاطر بے انداز تگ و دو کی ہے اور جسے دل سے یقین ہو جائے گا کہ علم صحیح معنوں میں طاقت ہے اور دینی اور دنیوی دونوں طرح کی ترقی' کامیابی اور سربلندی کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے' اس سے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے امکان کی حد تک علم کے حصول اور اس کی اشاعت کے لیے کوشش کرتا رہے گا۔

زندگی میں جو تھوڑا بہت تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملا ہے' اس کی بناء پر خیال یہی ہے کہ جانتے بوجھتے' ارادتاً خرابیاں کرنے والے لوگوں کی تعداد عموماً کم ہی ہوتی ہے۔ اکثریت غلط راستے صرف اس لیے اختیار کرتی ہے کہ انہیں صحیح راہوں کا علم نہیں ہوتا' یا کم از کم وہ صحیح راہوں کے شعوری علم سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ علم عربی زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے ''جاننا''۔ دنیا میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب اسی لیے کیا جاتا ہے اور بہت سی جہالتیں اسی لیے اختیار کر لی جاتی ہیں کہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ کام گناہ ہیں اور یہ اعمال جہالت ہیں۔ اگر علمِ دین عام ہو جائے تو بہت سے غلط کار صرف نیکی کا علم حاصل ہو جانے کے باعث ہی غلط راہوں سے منہ موڑ کر صحیح سمت کی طرف رخ کر لیں گے۔

خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امتِ مسلمہ میں سلف صالحین کی طرح علم کی اہمیت

اور فضیلت کا احساس پیدا فرمادے اور انہیں توفیق عطا کرے کہ وہ اپنے ان وسائل اور ذرائع کو، جواب بہت حد تک فضول نمود و نمائش، بیکار رسوم و رواج اور دوسری فضولیات پر صرف ہو رہے ہیں، حصولِ علم اور اشاعتِ علم پر صرف کر کے سعادتِ دارین حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ آمین

بنت الاسلام

یکم ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ



علم کی فضیلت

حضرت ابو قتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''آدمی اپنی موت کے بعد جو کچھ دنیا میں چھوڑ جاتا ہے' اس میں سے بہترین چیزیں تین ہیں۔ (ایک) نیک اولاد جو (بعد میں) اس کے لیے دعائے خیر کرتی ہے۔ (دوسرے) صدقہ جاریہ جس کا اجرا سے پہنچتا رہتا ہے' اور (تیسرے) وہ علم جس پر اس کے بعد عمل ہوتا رہتا ہے۔'' (ابن ماجہ)

زِرّ بن حُبَیش بیان کرتے ہیں کہ میں صفوان بن عَسّال مرادی کے پاس آیا تا کہ ان سے موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں پوچھوں۔ انہوں نے پوچھا کہ اے زر تم کیسے آئے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ علم کی تلاش میں۔ (اس پر) وہ بولے کہ بیشک فرشتے علم کے طالب کی طلب سے خوش ہونے کے باعث اس کے لیے اپنے بازو بچھا دیتے ہیں۔ (ترمذی)

علم کی تعریف وتوصیف میں جو کچھ فرمایا گیا ہے' اسے پڑھ کر دل میں بے اختیار یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سا علم ہے جس کی اتنی فضیلت آئی ہے۔ علوم تو دنیا میں بے شمار ہیں۔ ان میں سے بعض کو ''دینی علوم'' کہا جاتا ہے اور بعض کو ''دنیاوی علوم'' کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً علم قرآن' علم حدیث' علم فقہ وغیرہ ''دینی علوم'' کہلاتے ہیں اور ریاضی'

ہندسہ، منطق، فلسفہ، کیمیا، طبعیات، معاشیات، جغرافیہ وغیرہ ''دنیاوی علوم'' سمجھے جاتے ہیں۔اب قرآن وحدیث میں جو علم کی فضیلت آئی ہے، کیا وہ صرف ''دینی علوم'' ہی کے لیے ہے یا کہ ''دنیاوی علوم'' حاصل کرنا بھی اس فضیلت کا مستحق بنا دیتا ہے؟

اس بارے میں جو کچھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی رو سے انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ اپنے معبود کی بندگی کرے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (الذّٰريٰت : ٥٦)

''میں نے جن اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔''

دوسری طرف اسے علم حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ لا وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ط (المجادلة : ١١)

''تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا۔''

اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط (الزمر : ٩)

''(اے نبیؐ) ان سے پوچھو کہ کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے کبھی یکساں ہو سکتے ہیں۔''

نیز آپؐ کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ:

قُلْ رَبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا. (طٰه: ١١٤)

''دعا کرو کہ اے میرے رب مجھے مزید علم عطا فرما۔''

اب ان دونوں باتوں پر غور کیجئے کہ ایک طرف تو انسان کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ خدا کی بندگی کرے اور دوسری طرف اسے احساس دلایا گیا ہے کہ علم کا حصول اس کے لیے بہت فضیلت کی بات ہے۔ ان دونوں باتوں کو جوڑنے سے مندرجہ بالا سوال کا جواب خود بخود ہی حاصل ہو جاتا ہے کہ فضیلت والا علم درحقیقت وہ معلومات ہیں جن کے حاصل ہونے کے باعث انسان اپنا فریضہ بندگی بہتر طور پر سرانجام دے سکتا ہو۔ واضح رہے کہ لفظ "بندگی" کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت ہے۔ بندگی صرف نماز روزے ہی کا نام نہیں بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنے کا نام ہے اور بندگی میں صرف یہی نہیں آتا کہ ہم خود نیک بن کر بیٹھ جائیں اور خدا کی مخلوق کی کچھ پروانہ کریں کہ وہ جنت کی راہ پر چل رہی ہے یا دوزخ کی راہ پر' بلکہ یہ بھی بندگی کا ایک حصہ ہے کہ خدا نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہمیں اپنا جو آخری پیغام پہنچایا تھا' اسے ہم اس کی مخلوق تک پہنچائیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کے دین کو دنیا میں پھیلانے کے لیے کوشاں رہیں۔

سورۃ البقرہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ اس نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ یعنی نائب بنا کر بھیجا ہے۔ اب نائب کوئی خود مختار ہستی نہیں ہوتا بلکہ اس کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ سلطنت میں اصل حکمران کی مرضی کو نافذ کرے' خود بھی اس کا فرمانبردار رہے اور سلطنت والوں کو بھی اس کا فرمانبردار بنانے کی کوشش جاری رکھے۔ لہٰذا فضیلت والا علم وہ علم ہے جو انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ خدا کے نائب ہونے کی حیثیت سے جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ان کو بہتر سے بہتر طریقے سے انجام دے کر اپنے حکمرانِ حقیقی کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کر لے۔

اب بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے "دینی علوم" ہی مفید ہو سکتے ہیں نہ کہ "دنیاوی علوم"' لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن علوم کو "دنیاوی" کہا جاتا ہے

انہیں حاصل کرنے سے بھی اگر مقصد یہ ہو کہ ان کے ذریعے خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے اور اس کا نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض کو بہتر سے بہتر طریقے سے سرانجام دیا جائے' تو وہ بھی اسی طرح باعث فضیلت ہو جائیں گے' جس طرح دینی علوم۔ مثلاً ایک شخص طب کا علم حاصل کرتا ہے اور مقصد اس کا یہ ہے کہ اس کے ذریعے خدا کی دکھی مخلوق کی خدمت کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کروں اور مسلم معاشرے میں طبیبوں کی تعداد بڑھاؤں تا کہ وہ اپنے بیمار جسموں کے علاج کے لیے غیر مسلموں کے دروازوں پر نہ جائیں' تو اس کا طب کی تعلیم حاصل کرنا بھی اسے اس فضیلت کا مستحق بنا دے گا' جس کا خدا اور خدا کے رسولؐ نے وعدہ فرمایا ہے۔

ایسے ہی ایک مسلمان خالص نیت سے سائنس کی تعلیم حاصل کرتا ہے تا کہ مسلم معاشرے کو ایجادات کی وہ طاقت بہم پہنچائے جو اشاعت دین کی راہ میں مددگار ہو' تو اس کا سائنس پڑھنا بھی باعث فضیلت ہے۔

ایسے ہی معاشیات کا ایک طالب علم جدید معاشیات کے اصول و قواعد کو سمجھنے کے لیے جان کھپاتا ہے تا کہ وہ ان اصولوں کے اس حصے کے نقائص کامیابی سے واضح کر سکے جو اسلام کے معاشی اصولوں سے ٹکراتے ہیں اور اسلام کے معاشی نظام کی برتری اور افادیت ثابت کر دے' تو معاشیات اس کے لیے ایک "دنیاوی علم" نہیں بلکہ "دینی علم" بن جائے گا۔ کیونکہ اسے پڑھنے سے اس کا مقصد دین کی خدمت ہو گا۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ علوم بذاتِ خود "دینی" یا "دنیاوی" نہیں ہوتے بلکہ جس مقصد کو سامنے رکھ کر انہیں حاصل کیا جائے گا' وہ انہیں "دینی" یا "دنیاوی" بنائے گا۔ لہٰذا جن علوم کو رواجِ عام کے مطابق "دنیاوی" کہا جاتا ہے' وہ بھی ان تمام فضیلتوں کے حصول کا ذریعہ بن سکتے ہیں جن کا خدا اور خدا کے رسولؐ نے ذکر فرمایا ہے بشرطیکہ انہیں اس نیت سے

حاصل کیا جائے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری اور خدا کے دین کی خدمت گزاری میں امداد دیں اور انسان کے خدا کی فرمانبرداری اور خدا کے دین کی خدمت گزاری میں امداد دیں اور انسان کے خدا کا بہتر نائب بننے میں مددگار ہوں۔ باقی رہے وہ علوم جنہیں ''دینی'' کہا جاتا ہے۔ یعنی علم قرآن، علم حدیث، علم تفسیر، علم فقہ وغیرہ تو بلاشبہ وہ تو انسان کو اس قابل بناتے ہی ہیں کہ وہ خود خدا کا فرمانبردار رہے اور دوسروں کو فرمانبرداری کی دعوت دے، مگر نیت کی درستی کی شرط وہاں بھی موجود ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن یا حدیث کا علم حاصل کرتا ہے۔ مگر اس سے اس کا مقصود نہ خدا کی خوشنودی ہے نہ اس کے دین کی خدمت تو اس کے لیے کوئی فضیلت نہیں کیونکہ اس کا علم اسے خدا کا اچھا اور فرمانبردار نائب بننے اور فریضہ بندگی ادا کرنے میں مدد نہیں دے رہا۔ بعض غیر مسلم علماء انتہائی دقت نظر سے قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مگر مقصود ان کا یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی بات ڈھونڈ نکالیں، جسے الٹے معنی پہنا کر اسلام کے خلاف دشمنانہ پروپیگنڈا کر سکیں، تو پھر اس طرح اسلامی علوم حاصل کرنے پر ان کے لیے فرشتے اپنے بازو تو نہیں بچھا دیتے۔

مختصر یہ کہ علم حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت زیادہ فضیلت کی بات ہے، بشرطیکہ وہ طالب علم کو خدا کے قریب کرنے والا ہو نہ کہ دور لے جانے والا۔ قرآن پاک، احادیث نبویؐ اور سلف صالحین کے اقوال میں علم کی تعریف و توصیف میں بہت کچھ بیان کیا گیا ہے جن میں سے کچھ چیزیں درج ذیل ہیں:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (فاطر : ۲۸)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔''

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص

علم کی طلب میں کسی راہ پر چلا اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا۔ (ترمذی)

کثیر بن قیس بیان کرتے ہیں کہ میں (صحابی رسولؐ) حضرت ابو الدرداءؓ کے پاس دمشق کی مسجد میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "اے ابو الدرداءؓ میں مدینۃ الرسولؐ سے آپ کی خدمت میں ایک حدیث کی خاطر حاضر ہوا ہوں جس کے بارے میں مجھے خبر ملی ہے کہ آپ اسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور میں آپ کے پاس صرف اسی غرض کے لیے آیا ہوں" (میرے آنے کا اور کوئی مقصد نہیں، اس پر) حضرت ابو الدرداءؓ نے بیان کیا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو کوئی علم طلب کرنے کے لیے کسی راہ پر چلا اللہ اس کے سبب سے اسے جنت کی طرف جانے والی راہوں میں سے کسی راہ پر چلائے گا اور فرشتے خوشی کے باعث طالب علم کے لیے اپنے بازو بچھا دیتے ہیں اور عالم کے لیے بخشش مانگتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور مچھلیاں (بھی) جو پانی کے اندر ہیں اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت باقی سب ستاروں پر اور بے شک عالم لوگ انبیاءؑ کے وارث ہوتے ہیں اور تحقیق انبیاء دینار یا درہم کا ورثہ نہیں چھوڑتے، وہ تو صرف علم کا ورثہ چھوڑتے ہیں۔ پس جس نے اسے حاصل کر لیا، اس نے وافر حصہ حاصل کر لیا۔ (ابوداؤد)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دو ہی انسانوں پر رشک کرنا جائز ہے۔ ایک وہ شخص جسے خدا نے مال دیا اور پھر اسے اس بات پر قدرت دی کہ اسے راہِ حق میں خرچ کرے اور (دوسرے) وہ شخص جسے اللہ نے دانائی عطا کی۔ پس وہ اس کے ذریعے فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔" (بخاری)

حضرت قتادہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک پوری رات علمی مذاکرے میں گزار دینا

عبادت میں گزارنے سے بہتر ہے۔ ان کے اس قول کا امام احمدؒ کے آگے ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ علم ہے جس سے لوگ اپنے دین میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ابن عون کا بیان ہے کہ مجھے اور میرے بھائیوں کو تین چیزیں سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

۱۔ قرآن جس میں آدمی فکر وتدبر کرے اور وہ علم پا جائے جو پہلے حاصل نہ تھا۔

۲۔ عِلم سنت کی تحصیل وتکمیل میں کوشاں ہو۔

۳۔ اور یہ کہ سب آدمیوں کی بھلائی چاہے۔

اس روایت کو بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ ابن وضاع اس قول پر وجد کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "خوب ہے، خوب ہے"!

امام شافعیؒ علم کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جو شخص علم سے محبت نہ کرے اسے اپنا دوست نہ بناؤ۔"

"علم دین حاصل کرنے میں لگے رہنا نفل نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔"

"فرائض ادا کرنے کے بعد حصولِ علم میں مشغول رہنا ہی قربِ الٰہی حاصل کرنے کا سب سے افضل ذریعہ ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ صدیق کا فرمان ہے کہ "علم پیغمبروں کی میراث ہے اور مال کفار کی۔"

مسلم سپین کے مشہور عالم علامہ ابن عبدالبر اندلسی نے علم اور علماء کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہوئی ہے جس میں آپ نے علم اور علماء کے بارے میں نہایت دلچسپ اور معلومات افزا حالات جمع کیے ہوئے ہیں۔ کتاب کا نام "جامع بیان العلم وفضلہٖ" یعنی علم اور اس کی فضیلت کا جامع بیان۔ ذیل میں اس کتاب میں سے کچھ چیزیں پیش کی جا

رہی ہیں۔

علم حدیث کے کچھ طالب ایک عالم کے دروازے پر پہنچے۔ ان کی خواہش تھی کہ شیخ باہر نکلیں اور انہیں کچھ حدیثیں سنائیں' چاہے ایک دو ہی سنا دیں۔ جب شیخ باہر نکلے تو کہنے لگے کہ میرے ذہن میں ایک شعر ہے۔ تم میں سے جو کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ شعر کس شاعر کا ہے میں اسے تین حدیثیں سناؤں گا۔ طالبانِ حدیث میں ایک عراقی نوجوان بھی تھا' وہ بول اٹھا کہ آپ پر خدا کی رحمت ہو' وہ کون سا شعر ہے شیخ نے وہ شعر پڑھا۔

''دلوں کے لیے علم میں اسی طرح زندگی ہے جس طرح مینہ سے زمین زندہ ہو جاتی ہے۔''

شعر سن کر وہ عراقی نوجوان کہنے لگا کہ ''یہ تو سابق بربری کا شعر ہے۔''

شعر واقعی سابق بربری ہی کا تھا' اس لیے شیخ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اچھا اس شعر کے بعد کون سا شعر ہے۔ نوجوان نے دوسرا شعر پڑھ دیا۔

''علم اندھے پن کو دل سے اس طرح زائل کر دیتا ہے جس طرح چاند گھپ اندھیرے کو دور کر دیتا ہے۔''

اس پر شیخ بہت زیادہ خوش ہوئے اور ان لوگوں کے سامنے چھ حدیثیں بیان کر دیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت معاذؓ بن جبل کا آخری وقت آیا تو کنیز سے فرمانے لگے کہ کیا صبح ہوگئی۔ اس نے عرض کیا کہ ابھی نہیں ہوئی۔ آپ ایک ساعت چپ رہے' پھر فرمایا کہ اب دیکھو۔ اس نے کہا۔ جی ہاں صبح ہوگئی ہے۔ یہ سن کر فرمانے لگے کہ ایسی صبح سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو دوزخ کی طرف لے جانے والی ہو۔ پھر فرمایا کہ مرحبا' اے موت' ایسے مہمان مرحبا جو فاقے کے گھر میں آیا ہے اور فرمایا:

خدایا تو خوب جانتا ہے کہ معاذؓ دنیا میں رہنے کا اس لیے کبھی مشتاق نہ تھا کہ نہریں نکالے اور باغ لگائے۔ وہ تو بس اس لیے زندہ تھا کہ لمبی راتیں مشقت میں کاٹے' دن کی سخت گرمی میں حلق میں کانٹے ڈالنے والی پیاس برداشت کرے اور علمی حلقوں میں علماء کے ہجوم میں رہا کرے۔"

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ "دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ (بھی) ملعون ہے سوائے (ان چیزوں کے جو درج ذیل ہے' یعنی)

☆ اللہ کا ذکر'

☆ اور وہ جس کا اللہ کے ذکر سے تعلق ہو (یا جس کو اللہ پسند کرتا ہو)

☆ اور علم رکھنے والا'

☆ اور علم سیکھنے والا' (ابن ماجہ)

علم کی فضیلت میں کچھ اشعار روایت کیے گئے ہیں جنہیں حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔

"صورت کے لحاظ سے تمام آدمی یکساں ہیں' ان کا باپ آدمؑ اور ماں حوا ہے۔ سب کی ایک ہی قسم کی جان ہے۔ روحیں بھی مشابہ ہیں۔ سب میں ہڈیاں ہیں اور اعضاء ہیں۔ آدمی اگر اپنی اصلیت پر فخر کریں تو اصلیت تو مٹی اور پانی ہے۔ ہاں فضیلت ہے تو صرف علم والوں کو ہے اور وہی طالبانِ ہدایت کے رہنما ہیں۔"

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں۔ "خالص نیت سے صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حدیث کا علم حاصل کرنا دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔"

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کا مقولہ ہے:

''اگر زندگی ہے تو علم میں ہے' اگر راحت ہے تو معرفت میں ہے' اگر شوق ہے تو محبت (الٰہی) میں ہے' اگر ذوق ہے تو ذکر (الٰہی) میں ہے۔''

امام زہریؒ کا فرمان ہے۔ ''علم سے بہتر کوئی چیز نہیں جس سے خدا کی عبادت ممکن ہو۔''

سورۃ البقرہ آیت ۲۰۱ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔	''اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی اچھائی دے اور آخرت میں بھی اچھائی عطاء کر۔''

اس آیت کی تشریح میں حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ فی الدنیا حسنۃ سے مراد علم اور عبادت ہے اور فی الآخرۃ حسنۃ سے مراد جنت ہے۔

اسی کے بارے میں حضرت سفیان ثوریؒ کا بیان یہ ہے کہ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً سے مراد رزق حلال اور علم ہے اور فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً سے مراد جنت ہے۔

دونوں صاحبوں کا ارشاد ہے کہ ''سینے میں علم کی مثال ایسی ہے جیسے اندھیرے گھر میں چراغ۔''

عبیداللہ بن ابی جعفر فرمایا کرتے تھے کہ ''عالم لوگ دنیا کے لیے روشنی کے مینار ہیں۔ انہیں سے وہ نور پھوٹتا ہے جس سے گمراہ ہدایت پاتے ہیں۔''

ایسے ہی حضرت علیؓ کا فرمان ہے۔ ''علم مال سے بہتر ہے' کیونکہ مال کی تمہیں نگہبانی کرنی پڑتی ہے۔ مگر علم تمہارا نگہبان ہوتا ہے' مال خرچ کرنے سے ختم ہو جاتا ہے' مگر علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم۔ مالدار چل بسے مگر علم والے زندہ ہیں اور رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ بیشک ان کے جسم مٹ گئے ہیں۔ مگر ان کے کارنامے کبھی مٹنے والے نہیں'' !۔

علم کی ضرورت اور تاکید

دین اسلام نے اپنے پیروؤں کے لیے کچھ بنیادی عقائد کو لازمی قرار دیا ہوا ہے۔ جن میں سے کسی ایک کا انکار کرنے سے بھی انسان دائرہِ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً

خدا کی ذات اور صفات پر ایمان'
خدا کے فرشتوں پر ایمان'
خدا کی نازل کردہ کتابوں پر ایمان'
خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر ایمان'
اور آخرت پر ایمان'

ایسے ہی اس نے اپنے ماننے والوں کے لیے کچھ عبادات فرض قرار دے دی ہیں۔ جنہیں بغیر کسی شرعی عذر کے کسی صورت ترک نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً

توحید اور رسالت کی شہادت دینا'
نماز پڑھنا'
زکوٰۃ ادا کرنا'
رمضان کے روزے رکھنا'

اور بیت اللہ کا حج کرنا۔

ایسے ہی ملتِ اسلامیہ کو مضبوط اور سر بلند رکھنے کے لیے کچھ چیزیں لازمی کر دی گئی ہیں جنہیں نظر انداز کرنے سے مسلمان من حیث القوم کمزور اور سر نگوں ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

اللہ کی راہ میں جان اور مال سے جہاد کرنا'

اجتماعی طور پر اپنی قومیت کی بنیاد زبان' رنگ' علاقے اور نسل کے بجائے اسلامی اخوت پر رکھنا'

اور انفرادی طور پر اپنے نفس کو برائیوں سے پاک اور بھلائیوں کا عادی بنانے کے لیے کوشاں رہنا۔

اس کے علاوہ اسلام نے اسلامی معاشرے میں رہنے والوں کے مختلف گروہوں کے درمیان حقوق و فرائض کا نظام قائم کر رکھا ہے جس سے لاپروائی اور غفلت برتنا انسان کو گنہگار اور سزا کا مستحق بنا دیتا ہے۔ ہر طبقے کے مخصوص حقوق ہیں جو کسی دوسرے طبقے نے ادا کرنے ہیں۔ مثلاً

والدین کے حقوق' اولاد کے حقوق' شوہر کے حقوق' بیوی کے حقوق' رشتے داروں کے حقوق' ہمساؤں کے حقوق' کمزور طبقات مثلاً غلام' خدمت گار' مزدور' یتیم' بیوہ کے حقوق' مبتلائے تکلیف مثلاً بیمار' مفلس' مسکین' محتاج' مصیبت زدہ کے حقوق' مہمان کے حقوق' میزبان کے حقوق' قرضدار کے حقوق' قرض خواہ کے حقوق' حکمرانوں کے حقوق' رعایا کے حقوق' اسلامی برداری کے حقوق' عام انسانی برادری کے حقوق حتیٰ کہ جانوروں کے حقوق وغیرہ۔

پھر دین اسلام نے اپنے پیروؤں کو ایک ارفع نظامِ اخلاق دیا ہے جو انسان کو اس

قابل بناتا ہے کہ وہ افراط وتفریط سے محفوظ رہ کر ایک صحیح معتدل زندگی گزار سکے۔

اس نظامِ اخلاق کی جن چیزوں کو خاص اہمیت دی گئی ہے' وہ یہ ہیں: حیا' امانت و دیانت' سچائی' حسنِ معاملہ' فرض شناسی' صبر وتحمل' عفوودرگزر' صلہ رحمی' منشیات سے بچنا' عہدہ وجاہ اور زرومال کی حرص سے اجتناب' فخر وغرور سے پرہیز وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ انسان نے زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روزی بھی کمانا ہوتی ہے۔ نسل انسانی کی بقا اور عمدہ پرورش وتربیت کے لیے نکاح بھی کرنا ہوتا ہے' اسے ایک دوسرے کی زیادتی سے بچنے کے لیے قانون اور عدالتوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور اسے اپنی قومی آزادی کی حفاظت کرنے اور اپنی اجتماعی ضروریات پوری کرنے کے لیے حکومت بھی قائم کرنی ہوتی ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کے باعث ان تمام امور کے بارے میں اصولی ہدایات دیتا ہے' جن سے وہی لوگ لاپروائی برت سکتے ہیں جنہیں ایک سچا اور مکمل مسلمان بننے کی خواہش نہ ہو۔

ان تمام اصول واحکام پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ایک صحیح اسلامی زندگی گزارنے کے لیے بہت کچھ علم حاصل کرنا پڑتا ہے اور ایک جاہل مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ صحیح اسلامی زندگی گزار سکے۔ مثال کے طور پر مندرجہ بالا امور میں سے چند ایک ہی پر نگاہ ڈال لیجئے اور پھر غور کیجئے کہ ان کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لیے علم کا حصول کتنا ضروری ہے۔

مثلاً اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے اور ایک سچا موحد بننے کے لیے یہ لازمی ہے کہ انسان کو عقیدۂ توحید پر ایمان لانے کے تمام تقاضوں سے واقفیت حاصل ہو اور وہ شرک کی مختلف اقسام کو پہچانتا ہو' ورنہ عین ممکن ہے کہ توحید پر ایمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود وہ زندگی بھر مشرکانہ اعمال کرتا ہی چلا جائے اور اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ شرک کا

ارتکاب کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم

کہ دانم مشکلاتِ لا الہ

(جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو میں لرز جاتا ہوں' کیونکہ میں جانتا ہوں کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا اقرار کرنے کے باعث انسان پر کیا کیا مشکل ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں)

خود کلامِ پاک کا فرمان ہے۔

''اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور علم والے بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں۔''

(سورہ آلِ عمران' آیت ۱۸)

ایسے ہی فرض عبادات میں سے صرف زکوٰۃ ہی کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی ادائیگی کی صحت کے لیے اچھا خاصا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والے کو لازماً معلوم ہونا چاہیے کہ:

مال کی کس کس قسم پر زکوٰۃ مال عائد ہوتی ہے۔

کسی شخص کا قابلِ زکوٰۃ کس حد پر پہنچے تو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کے کس مال کی کیا شرح ہوگی۔

وہ کون لوگ ہیں جنہیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

وہ کون سے مصارف ہیں جہاں زکوٰۃ صرف کرنا ممنوع ہے۔

اور زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے کن اصول قاعدوں کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جب تک زکوٰۃ ادا کرنے والے کو یہ معلومات حاصل نہ ہوں' وہ اس فریضے کو بحسن وخوبی ادا نہیں کرسکتا۔ مثلاً عین ممکن ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا تو کرے مگر غیر مستحق لوگوں کو دے کر یا ممنوع مصارف پر صرف کر کے اسے ضائع کر دے۔

ایسے ہی اسلامی معاشرے کے مختلف طبقات میں سے ہر طبقے نے کسی دوسرے طبقے کو کچھ دینا ہوتا ہے اور کچھ اس سے لینا ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم نے دوسروں کو دینا ہے' وہ ہمارے فرائض ہیں اور جو ہم نے دوسروں سے لینا ہے' وہ ہمارے حقوق ہیں۔ اب جب تک کسی انسان کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ معاشرے کے جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس نے دوسروں کو دینا کیا ہے اور ان سے لینا کیا ہے' وہ نہ اس قابل ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق ادا سکے اور نہ اس قابل ہوتا ہے کہ دوسروں سے اپنے حقوق لے سکے۔ اس لیے عین ممکن ہو کہ ایک انسان دوسرے کے حقوق تلف کر کے گناہوں کے انبار سمیٹے چلا جا رہا ہے مگر دل میں اس بات کا پورا یقین رکھتا ہو کہ وہ تو بڑا ہی انصاف پسند شخص ہے۔

ایسے ہی روزی کمانے کے مختلف ذرائع میں سے صرف تجارت ہی پر نگاہ ڈال لیں۔ ایک سچے مسلمان تاجر کو لازماً معلوم ہونا چاہیے کہ تجارتی دیانت کے اسلامی اصول کیا ہیں اور اپنے سامانِ تجارت کا کتنا حصہ اسے لازماً ہر سال مستحقین تک پہنچانا ہوگا۔ اگر وہ ان اصولوں سے ناواقف ہے تو عین ممکن ہے کہ اس کے مال میں حرام کی آمیزش ہوتی چلی جائے اور اسے کبھی بھی پتہ نہ چلے کہ وہ تو ایک خائن اور بددیانت تاجر ہے۔

نکاح کر کے گھر بسانا اور اگر کوئی شادی کامیاب نہ ہو سکے تو اسے ختم کرنے کے قابل ہونا انسانی معاشرے کی ناگزیر ضروریات میں سے ہے۔ لہٰذا اسلام نے نکاح اور طلاق اور ان سے تعلق رکھنے والے امور کے بارے میں تفصیلی ہدایات دے رکھی ہیں جن سے ایک مسلمان کو لازماً واقف ہونا چاہیے۔ ورنہ اس کے ایک ظالم اور غیر ذمہ دار شوہر بنے

ایک اور خائن اور نافرمان بیوی بننے کا خدشہ موجود رہے گا اور اس بات کا خطرہ بھی خلافِ قیاس نہیں کہ ایک جوڑے کا نکاح از روئے اسلام ختم ہو چکا ہو۔ مگر وہ جہالت کے باعث اسے قائم ہی سمجھیں اور غیر شرعی طور پر اکٹھے زندگی گزارتے رہیں۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ انہیں پر دوسرے امور کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہونا اور پھر جاہل رہنا گویا دو متضاد باتیں ہیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ اس وقت مسلم معاشرے کی اکثریت جہالت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ ایک سچے اور صحیح مسلمان کی زندگی گزارنے کے لیے علم ناگزیر ہے۔ اگر اس وقت ہماری اکثریت جاہل ہے تو پھر یہ بھی تو واضح ہے کہ اس وقت ہم میں سے اکثر لوگ صرف نام کے مسلمان ہیں۔ صحیح اسلامی زندگی سے ہمارا کوئی قریبی تعلق قائم نہیں رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کے بغیر انسان نہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کر سکتا ہے نہ اپنی پہچان۔ انسان کو خدا تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس شرف کو قائم رکھنے کے لیے اسے علم کی شدید ضرورت ہے تاکہ وہ زندگی گزارتے ہوئے ایک ارفع نصب العین کو سامنے رکھ سکے۔ ورنہ اس کی اور چوپاؤں کی زندگی میں بہت کم فرق رہ جائے گا۔ جس طرح وہ کھاتے ہیں' پیتے ہیں' آرام کرتے ہیں' اپنی دوسری ناگزیر ضروریات پوری کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی اگر اپنی زندگی کا مقصد ان مادی ضروریات کی تکمیل ہی کو قرار دے لے تو پھر وہ کس بناء پر دوسری مخلوقات سے اشرف ہونے کا دعویٰ کر سکے گا۔

جامع ترمذی ابواب الزہد کی ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے چار قسم کے انسانوں کا حال بیان فرمایا ہے۔

ایک وہ شخص ہے جس کے پاس مال بھی ہے اور علم بھی' چنانچہ علم ہونے کی بناء پر وہ اپنے مال کو ایسے مصارف پر صرف کرتا ہے جن پر اسے صرف ہونا چاہیے' وہ اس سے رشتے

داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے مال میں اللہ تعالیٰ کا کیا حق ہے۔ اس شخص کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ وہ بہترین مرتبے پر ہے۔

دوسرا شخص وہ ہے جس کے پاس مال تو نہیں مگر علم ہے۔ علم ہونے کے باعث اُسے معلوم ہے کہ مال کے صحیح مصارف کیا ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں اسے فلاں اور فلاں مصرف پر صرف کرتا۔

حضورؐ کا فرمان ہے کہ یہ دونوں اشخاص اجر میں برابر ہیں۔ کیونکہ اگرچہ دوسرے شخص نے مال صرف نہیں کیا، لیکن چونکہ وہ مال کے صحیح مصارف جانتا تھا، اگر اس کے پاس مال ہوتا تو وہ اسے انہیں مصارف پر صرف کرتا۔ اپنی نیت کی اس نیکی کے باعث اسے اتنا ہی اجر ملے گا جتنا پہلے کو۔

پھر حضورؐ نے ایک تیسرے شخص کا حال بھی بیان فرمایا ہے، جس کے پاس مال تو ہے مگر علم نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی بے علمی کے باعث مال کے معاملے میں خدا سے نہیں ڈرتا اور اسے صحیح مصارف پر صرف نہیں کرتا۔ نہ اس سے رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے، نہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کا کیا حق ہے۔ اس تیسرے شخص کے بارے میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ وہ بدترین رتبے پر ہے......

یہ حدیث واضح کیے دیتی ہے کہ علم نہ ہونے کے باعث انسان اپنی مادی خوش حالی سے بھی پورا اور صحیح فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ مختصر یہ کہ اسلام نے جو نظامِ حیات ہمیں عطا فرمایا ہے وہ طلب علم کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین پسند اور عقلمند لوگ ہمیشہ طلبِ علم کی تاکید کرتے رہے ہیں۔

حضرت ابوالدرداءؓ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؓ فرماتے تھے:

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے علماء اُٹھتے جا رہے ہیں اور تمہارے جاہل

لوگ علم حاصل نہیں کرتے۔ لوگو! علم حاصل کرو اس سے پہلے کہ وہ اٹھالیا جائے علم کا اُٹھ جانا اہلِ علم کا مٹ جانا ہے۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم اس چیز کے پیچھے پڑے ہو جو تمہیں ضرور ملے گی (یعنی رزق) اور اس چیز سے بے فکر ہو جس کی تحصیل تم پر واجب ہے (یعنی علم)۔"

نیز آپؓ کا فرمان ہے:

"میں ڈرتا ہوں کہ اگلے چلے جائیں اور پچھلے علم حاصل نہ کریں۔ اگر عالم مزید علم حاصل کریں گے تو ان کا علم بڑھ جائے گا اور خود علم میں ذرا کمی نہ پڑے گی اور اگر جاہل علم طلب کریں گے تو علم کو اپنے لیے ہموار پائیں گے۔ یہ کیا ہے کہ میں تمہیں کھانوں سے لبریز اور علم سے خالی دیکھتا ہوں۔"

حضرت عمر فاروقؓ کے حالات میں ملتا ہے کہ آپؓ نے علمِ قرآن عام کرنے کے لیے معلم اور قاری مقرر فرمائے اور مکتب جاری کیے۔ مکاتب میں لکھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ آپؓ نے عام طور پر اضلاع میں احکام بھیجے کہ بچوں کو شہسواری اور کتابت کی تعلیم دی جائے۔ احادیث کے ایک راوی ابو عامر سلیم بیان کرتے ہیں کہ میں بچپن میں گرفتار ہو کر مدینہ آیا۔ یہاں مجھے مکتب میں بٹھایا گیا۔ معلم جب مجھ سے میم لکھواتا تھا اور میں اچھی طرح نہیں لکھ سکتا تھا تو کہتا تھا کہ گول لکھو جیسے گائے کی آنکھ ہوتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آپؓ نے خانہ بدوش بدوؤں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم جبری طور پر قائم کی۔ چنانچہ ایک شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا' چند آدمیوں کے ساتھ مامور کیا کہ قبائل میں پھر پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جس کو قرآن مجید کا کوئی حصہ یاد نہ ہو' اس کو سزا دے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا طریقہ تھا کہ اضلاع کے لیے جب افسر مقرر کرتے تو اس بات کا دھیان رکھتے کہ وہ عالم اور فقیہہ ہوں تا کہ لوگوں کی علمی اور دینی رہنمائی بھی کر سکیں۔

آپؓ نے مختلف مواقع پر اس کا اعلان بھی کیا۔ ایک دفعہ مجمع عام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تم لوگوں کو اس بات پر گواہ کرتا ہوں کہ میں نے افسروں کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں کو مسائل اور احکام بتائیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قاضی ابوبکر بن حزم کو' جو ان کی طرف سے مدینہ منورہ کے گورنر تھے' حکم بھیجا۔

''احادیث نبویہ کو تلاش کر کے ان کو لو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہو جانے کا خوف معلوم ہوتا ہے۔''

سعد بن ابراہیم بیان کرتے ہیں:

''ہمیں عمر بن عبدالعزیزؒ نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا اور ہم نے دفتر کی دفتر حدیثیں لکھیں اور انہوں نے ایک ایک مجموعہ ہر جگہ جہاں جہاں ان کی حکومت تھی' بھیجا۔''

بنوامیہ کے خلیفہ عبدالملک نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

''علم حاصل کرو کیونکہ مالدار ہو گے تو علم تمہارا جمال ہو گا اور غریب ہو گئے تو علم تمہارے لیے دولت ثابت ہو گا۔''

ابن المقفع کا ایک قول ہے:

''علم حاصل کرو' بادشاہ ہوئے تو اور اُونچے ہو جاؤ گے اور اگر عام آدمی ہوئے تو زندہ رہ سکو گے۔''

مشہور دینی تحریک الاخوان المسلمون کے بانی جناب حسن البناؒ اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پڑھنے لکھنے میں مہارت پیدا کیجئے۔ اخوان کے رسائل' اخبارات اور دوسرے لٹریچر کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کا اپنا ایک کتب خانہ ہونا چاہیے' خواہ چھوٹا سا ہی ہو اور اگر آپ

کسی فن کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہوں تو اس فن میں کمال حاصل کیجئے۔ عالمِ اسلام کے مسائل پر نگاہ رکھیے اور جہاں تک ممکن ہو ایسے نتائج تک پہنچنے کی کوشش کیجئے جو اہلِ فکر کے نتائج سے مطابقت رکھتے ہوں۔"

حسن البنا شہیدؒ ہی کا ایک اور مقولہ ہے:

"حصولِ علم دراصل جہاد ہے اور ہمیں چاہیے کہ علم کی راہ میں جس قدر بڑی قربانی بھی دینی پڑے، دریغ نہ کریں۔

☆ **آخری لمحات تک طالبِ علم:** حصولِ علم کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ علم حاصل کرنا عمر کے کسی خاص حصے تک مقید نہیں بلکہ جب تک زندگی ہے طلبِ علم جاری رکھنی چاہیے۔ جب اسلام آیا تو بعض صحابہؓ عمر رسیدہ ہو چکے تھے، مگر انہوں نے اس حالت میں بھی دین کا علم حاصل کیا۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ کا ایک فرمان نقل کیا گیا ہے کہ:

"سردار (یا بزرگ) بننے سے پہلے علم حاصل کرلو۔"

یہ فرمان بیان کرنے کے بعد امام بخاریؒ اپنی طرف سے لکھتے ہیں کہ:

"سردار (یا بزرگ) بننے کے بعد بھی علم حاصل کرو، کیونکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ نے بوڑھا ہونے کے بعد بھی علم حاصل کیا۔"

ایک مشہور مقولہ ہے:

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ. (گہوارے سے قبر تک علم کی طلب جاری رکھو)

جن بزرگوں نے اس مقولے پر عمل کیا انہیں زندگی میں کوئی سٹیج ایسی نظر نہ آئی جب اس پر عمل کی ضرورت نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو علم سے بے انتہا شغف تھا۔ آپ چوٹی کے علماء میں سے تھے، مگر پھر بھی اپنے علم کو بڑھانے کے لیے کوشاں رہتے۔

ایک دفعہ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ آخر کب تک علم حاصل کرتے رہیں گے۔تو فرمایا:

''موت تک انشاءاللہ!''

ایک اور موقع پر ایسے ہی سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:''شاید وہ کلمہ میں نے ابھی تک نہ سنا ہو جو میرے کام آنے والا ہو۔''

ابن العلاء سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آدمی کو علم کب تک حاصل کرنا چاہیے۔ اس نے جواب دیا کہ ''جب تک زندگی اس پر مہربان رہے!'' یعنی جب تک وہ زندہ رہے۔

امام ابن السنی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن لکھتے لکھتے قلم کو دوات کے منہ پر رکھ دیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور حالتِ دعا ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔اس وقت آپ کی عمر اسی سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔

ابوالعباس ثعلب کی عمر اکانوے برس کی ہو چکی تھی۔ایک دن جمعے کے بعد مسجد سے نکلے اور گھر کو جانے لگے۔گھر کی طرف چل رہے تھے اور ساتھ ساتھ ایک کتاب کا مطالعہ بھی کرتے جا رہے تھے۔عمر کی زیادتی کے باعث قوتِ سماعت بھی ٹھیک نہ رہی تھی اور نگاہیں تو کتاب پر لگی تھیں' ایک گھوڑے کا دھکا لگا اور اس کے صدمے سے بیہوش ہو کر گر پڑے۔غشی کی حالت میں گھر لے جائے گئے اور اسی حالت میں وفات فرمائی۔

ایک دفعہ منصور بن مہدی نے خلیفہ مامون الرشید سے سوال کیا کہ کیا بوڑھوں کو بھی علم حاصل کرنا چاہیے۔مامون نے جواب دیا کہ اگر جہالت بوڑھوں کے لیے معیوب ہے تو انہیں ضرور علم حاصل کرنا چاہیے۔

جو شخص علم کا سچا طالب ہوگا' وہ کبھی اپنے آپ کو اتنا بڑا عالم نہیں سمجھے گا کہ مزید علم حاصل کرنے کو بے کار گمان کرنے لگے۔کیونکہ حاصل کیے ہوئے علم کو محفوظ رکھنے کے لیے اور اس کے ذخیرے کو بڑھانے کے لیے اس بات کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے کہ انسان طلب

علم کو حتی الامکان قائم رکھے۔

ابن ابی غسان کا مقولہ ہے کہ ''آدمی اسی وقت تک عالم ہے جب تک کہ طالب علم ہے اور جب وہ طالب علمی کو خیر باد کہہ دے تو اس وقت سے جاہل ہے!''

امام شافعیؒ علم کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ آپ کا فرمان ہے کہ:

''جو شخص علم حاصل نہ کرے اُسے دوست مت بناؤ۔''

ایسے ہی عربی میں ایک مقولہ ہے:

''جس نے علم حاصل کیا اور عمل نہ کیا اس کے لیے ایک ہلاکت ہے اور جو جاہل ہے مگر علم حاصل نہیں کرتا' اس کے لیے دو ہلاکتیں ہیں۔''

علم کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ کلام پاک کا جو لفظ سب سے پہلے نازل ہوا وہ ''اقراءُ'' ہے جس کا مطلب ہے ''پڑھ''۔ یہ سورۃ العلق کی پہلی آیت کے آغاز میں آیا ہے۔

سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''پڑھ (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔
جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھ اور
تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا (جس
نے) انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔''

ان آیات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو قلم کے ذریعے علم سکھایا ہے' یہ انسان پر اس کا ایک کرم ہے۔

ایسے ہی جامع ترمذی میں حضرت عبادہؓ بن صامت کا ایک بیان روایت کیا گیا ہے کہ:

''......میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ پہلی شے جو اللہ تعالیٰ

نے پیدا کی ''قلم'' تھا۔

☆ **جہالت کی مذمت:** رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم' بزرگانِ دین اور علمائے کرام نے جہاں ایک طرف حصولِ علم کی تاکید کی ہے وہاں دوسری طرف جہالت کی مذمت میں بھی بہت کچھ فرمایا ہے۔

حضرت ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہدایت اور علم مجھے دے کر بھیجا گیا ہے' اس کی مثال زوردار بارش کی سی ہے کہ وہ کسی زمین پر جا برسی۔ اُس زمین میں ایک عمدہ حصہ تھا۔ اس نے پانی کو قبول کیا۔ پھر گھاس اور ہرا سبزہ خوب اُگایا اور اس زمین میں سخت حصے بھی تھے۔ اُنہوں نے پانی کو روک لیا۔ پس (اُس رُکے ہوئے پانی) سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو نفع پہنچایا۔ انہوں نے خود پانی پیا اور (جانوروں کو) پلایا اور کھیتی باڑی کی اور یہ بارش زمین کے ایک اور حصے میں بھی برسی جو صاف چٹیل میدان تھا کہ نہ اس نے پانی روکا اور نہ گھاس اُگائی (پھر آپؐ نے فرمایا کہ) یہ مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین کو سمجھا اور جو (ہدایت) خدا نے میرے ذریعے بھیجی تھی' اس نے اُسے نفع دیا' اُس نے خود علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا' اور (آخری) مثال اُس شخص کی ہے جس نے اس (علم دین) کی طرف اپنے سر کو بھی نہ اٹھایا اور نہ اس ہدایت کو جو مجھے دے کر بھیجا گیا تھا' قبول کیا۔ (بخاری)

اس حدیث میں حضورؐ نے علمِ دین کی طرف سے غفلت اور لاپروائی برتنے والے شخص کو اس صاف چٹیل زمین سے تشبیہ دی ہے جس پر بارش برستی ہے۔ مگر وہ اس بارش سے نہ اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ حاصل کرتی ہے اور نہ اس کے ذریعے کسی دوسرے کو کوئی فائدہ پہنچاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ علم دین اُس بارانِ رحمت کی مانند ہے جس میں انسانوں کے لیے فائدے ہی فائدے ہیں۔ مگر جو انسان اسے حاصل نہیں کرتا اور اس

سے جاہل رہتا ہے وہ خود بھی ان فوائد سے محروم رہتا ہے اور کسی اور کو بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اُسے بندوں (کے سینوں) سے کھینچے بلکہ علماء کو موت دے کر علم کو اُٹھالے گا (کہ جب عالم ختم ہو جائیں گے تو علم بھی ختم ہو جائے گا) یہاں تک کہ جب کوئی علم والا نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے۔ پھر اُن (جاہلوں) سے (دینی مسائل) پوچھے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ پھر (خود ہی) گمراہ ہوں گے اور (دوسروں کو بھی) گمراہ کریں گے۔ (بخاری)

غرضکہ اسلام نے علم کو بہت زیادہ فضیلت عطا کی ہے اور ایک صحیح اور سچا مسلمان بننے کے سلسلے میں علم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا صلحائے امت نے حصولِ علم کو ہمیشہ عبادت کا درجہ دیے رکھا اور اس معاملے میں اُن کے شوق کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ علمی بے حسی دیکھتے ہوئے وہ تعجب انگیز نظر آتا ہے!





مُسلمانوں کا شوقِ علم

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فرمان ہے۔"دل مردہ ہے اور اس کی زندگی علم سے ہے۔علم بھی مردہ ہے اور اس کی زندگی طلب پر منحصر ہے۔"

یہ طلب مسلمانوں میں اتنی پیدا ہو چکی تھی کہ ان کا شوقِ علم اُنہیں بحر و بر میں لیے پھرتا تھا اور کوئی مشکل ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔ مسلمانوں کی حکومت اس وقت ایشیا' افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں میں پھیل چکی تھی۔تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات تلاشِ علم میں لوگ ایک براعظم سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں جا پہنچتے تھے۔

مشہور عالم ابن الاعرابی کوفی نے ایک روز اپنے درس میں دو آدمیوں سے جو باہم باتیں کر رہے تھے' ان کے وطن دریافت کیے۔ان میں سے ایک نے اپنا وطن اسپیچاب بتایا جو چین کی سرحد کے متصل تھا اور دوسرے نے اندلس (یعنی سپین) بتایا جو یورپ کا انتہائی مغربی ملک تھا۔

اور یہ اس وقت کی بات ہے جب ہوائی جہاز اور ٹرینیں نہیں ہوتی تھیں اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پہنچنا بہ نسبت آج کل کے خاصا دشوار ہوتا تھا۔مختلف علوم خصوصاً علمِ حدیث کے لیے علمائے اسلام نے جس طرح تنگ و دو کی اور مشقتیں اٹھائیں' وہ

داستان دراز بھی ہے' دلچسپ بھی اور جوش انگیز بھی۔ ذیل کے واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا شوقِ علم کس مقام پر پہنچ چکا تھا۔

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت میں کم سن تھا۔ میں نے اپنے ایک ہم عمر انصاری لڑکے سے کہا کہ چلو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کر لیں' کیونکہ ابھی وہ بہت ہیں۔ انصاری لڑکے نے جواب دیا کہ ابن عباسؓ، تم بھی عجیب آدمی ہو' اتنے صحابیوں کی موجودگی میں لوگوں کو بھلا تمہاری کیا ضرورت پڑے گی۔ اس پر میں نے انصاری لڑکے کو چھوڑ دیا اور خود علم حاصل کرنے میں لگ گیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ معلوم ہوتا کہ فلاں صحابیؓ کے پاس فلاں حدیث ہے تو میں اُن کے گھر دوڑا جاتا۔ اگر وہ قیلولے میں ہوتے تو میں اپنی چادر کا تکیہ بنا کر ان کے دروازے ہی پر پڑ رہتا اور گرم ہوا میرے چہرے کو جھلساتی رہتی۔ جب وہ صحابیؓ باہر آتے اور مجھے اس حال میں پاتے تو متاثر ہو کر کہتے۔ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی' آپ کیا چاہتے ہیں؟'' میں کہتا۔ ''سنا ہے کہ آپؓ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں حدیث روایت کرتے ہیں' اسی کی طلب میں حاضر ہوا ہوں۔'' وہ کہتے۔ ''آپ نے کسی کو بھجوا دیا ہوتا تو میں خود چلا آتا۔'' میں جواب دیتا۔ ''نہیں' اس کام کے لیے خود مجھی کو آنا چاہیے تھا۔'' پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ وفات پا گئے تو پھر وہی انصاری دیکھتا کہ لوگوں کو میری کیسی ضرورت ہے اور حسرت سے کہتا۔ ''ابن عباسؓ، تم مجھ سے زیادہ عقلمند تھے!''

حضرت عمر فاروقؓ بیان کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اور اُن کے ایک انصاری پڑوسی نے باہم یہ معاملہ کر رکھا تھا کہ ایک دن وہ حضورؐ کی خدمت میں جاتے اور دوسرے دن انصاری پڑوسی جاتے۔ جس دن حضرت عمرؓ جاتے جو کچھ وہاں سے سنتے وہ رات کو آ کر اپنے

انصاری پڑوسی کو بتادیتے اور جس دن انصاری پڑوسی جاتے وہ اس دن کے حالات حضرت عمرؓ کو آکر بتادیتے اور اس طرح دونوں اس علم دین کو حاصل کرتے جاتے جو حضورؐ صحابہؓ کو تعلیم فرماتے۔

حضرت عمرانؓ بن حصین بیان کرتے ہیں کہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ (قبیلہ) بنوتمیم کے کچھ لوگ آئے تو حضورؐ نے فرمایا کہ اے بنوتمیم، خوش خبری قبول کرو۔ ان لوگوں نے کہا کہ آپؐ نے ہمیں خوشخبری دی ہے تو کچھ عطا بھی کیجئے۔ پھر اہلِ یمن میں سے کچھ لوگ آئے تو حضورؐ نے فرمایا کہ اے اہلِ یمن، خوشخبری قبول کرو، اس لیے کہ بنوتمیم نے اُسے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اسے قبول کیا اور ہم تو آپؐ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور اس امر (یعنی دنیا) کی ابتداء کے متعلق سوال کریں کہ (اس سے پہلے) کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی شے نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور لوح محفوظ میں تمام چیزیں لکھ دیں۔ (اس طرح حضورؐ دین کی باتیں بتارہے تھے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی سن رہا تھا) پھر (کیا ہوا کہ) ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے عمران، اپنی اونٹنی کی خبر لے، وہ بھاگ گئی ہے۔ میں اس کی تلاش میں چل پڑا تو دیکھا کہ وہ سراب سے پرے نکل گئی تھی اور خدا کی قسم مجھے یہی پسند تھا کہ اونٹنی چلی جاتی تو چلی جاتی، مگر میں (حضورؐ کے پاس سے) نہ اُٹھتا۔ (بخاری)

امام ابن تیمیہؒ کو تفسیر قرآن میں خاص دلچسپی تھی۔ ان کے سوانح حیات میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے تفسیر قرآن کے سلسلے میں چھوٹی بڑی سو سے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس کے علاوہ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ تضرع وزاری سے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگتے تھے کہ وہ قرآن کے فہم کے لیے اُن کے سینے کو کھول دے۔ کلام پاک کو سمجھنے میں انہوں نے جو محنت

اور کوشش کی اس کے بارے میں وہ خود بیان کرتے ہیں:

"بعض اوقات ایک آیت کے لیے میں نے سو سو تفسیروں کا مطالعہ کیا۔ مطالعے کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ مجھے اس آیت کا فہم عطا فرمائے۔ میں عرض کرتا کہ آدمؑ وابراہیمؑ کے معلم' مجھے بھی تعلیم فرما۔ میں سنسان اور غیر آباد مساجد اور مقامات کی طرف چلا جاتا' اپنی پیشانی پر خاک ملتا اور عرض کرتا کہ اے ابراہیمؑ کی تعلیم دینے والے مجھے سمجھ عطا فرما۔"

امام ابن تیمیہؒ کے خاندان کی علم دوستی کا یہ حال تھا کہ جب اُن کا وطن حران تاتاریوں کے حملے کی زد میں آ گیا تو انہوں نے وہاں سے ہجرت کر کے دمشق کا رُخ کیا۔ اس ہجرت میں انہوں نے اپنا باقی مال ومتاع تو وہیں چھوڑ دیا۔ مگر اپنا قیمتی کتب خانہ' جو کئی پشتوں کا سرمایہ تھا' ایک گاڑی پر بار کر کے ساتھ لے گئے۔ پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت تھی۔ ہر وقت تاتاریوں کا کھٹکا لگا رہتا تھا' عورتوں اور بچوں کا ساتھ تھا اور کتابوں کی گاڑی کو چلانے کے لیے جانور بھی موجود نہیں تھے' تاہم اس علم دوست خاندان نے اپنا کتب خانہ چھوڑنا گوارا نہ کیا اور جانوروں کی جگہ خود اُس گاڑی کو کھینچتے رہے۔ ایک جگہ گاڑی چلتے چلتے رُک گئی تو خاندان کے لوگوں نے دعا کی اور گریہ زاری کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور گاڑی پھر چل پڑی۔ اسی طرح سختیاں سہتے اور تکالیف اٹھاتے یہ علم دوست لوگ دمشق جا پہنچے۔

حافظ ابن فرات بغدادی نے جب وفات پائی تو ان کے ترکے میں کتابوں کے اٹھارہ صندوق تھے۔ ان اٹھارہ صندوقوں میں جو کتابیں بھری تھیں' اُن میں سے اکثر انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھی ہوئی تھیں۔

امام ابن جوزی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جن قلموں سے وہ حدیث شریف کی

کتابیں لکھتے تھے' اُن کا تراشہ جمع کرتے جاتے تھے' جب وفات پانے لگے' تو وصیت کی کہ میرے غسل کا پانی اسی تراشے سے گرم کیا جائے۔ چنانچہ جس پانی سے نہیں غسل دیا گیا تھا' اُسے اسی مقدس ایندھن سے گرم کیا گیا تھا۔

حضرت شہباز محمد بھاگلپوری جس درسگاہ میں پڑھتے تھے' اس کے مالک میں اتنی مالی استطاعت نہ تھی کہ رات کو طلبہ کے لیے روشنی کا انتظام کر سکے۔ حضرت شہباز محمد نے ایک سبزی فروش سے درخواست کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں رات کو آپ کی دکان کی روشنی میں مطالعہ کر لیا کروں۔ اُس نے اجازت دے دی۔ ایک رات شہر کے کسی دولت مند شخص کے گھر کی کسی شادی کا جلوس اس دکان کے پاس سے گزرا۔ جس میں رقص و رنگ اور طبل و چنگ کا بندوبست بھی تھا۔ شائقین اس دکان کے سامنے جمع ہو گئے اور رات کو وہاں ہنگامہ شادی برپا رہا۔ صبح دکاندار نے حضرت شہباز سے پوچھا کہ آپ نے اس سے پہلے بھی کبھی ایسی دھوم دھام والی شادی دیکھی تھی' تو پتہ چلا کہ وہ رات کو اپنے مطالعے میں ایسے مستغرق تھے کہ اُنہیں اس دھوم دھام اور شان و شوکت کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ دکاندار کے سوال پر اُنہوں نے حیران ہو کر کہا کہ کیسی شادی اور کہاں کی دھوم دھام' مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔

امام زُہری کی زندگی اس طرح علم میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اپنے علمی انہماک میں دنیا ومافیہا حتیٰ کہ بیوی تک سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ جب گھر آتے تو چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر لگا کر اُن میں گم ہو جاتے۔ ایک دن اُن کی بیوی تنگ آ کر کہہ اُٹھیں۔ ''خدا کی قسم' یہ کتابیں تو میرے لیے تین سوکنوں سے زیادہ تکلیف دہ ہیں!۔''

مسلمانوں کی علم دوستی پر جو کتب لکھی گئی ہیں' اُن میں سے بعض کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ مختلف علمی مجالس میں طالبانِ علم کی تعداد کیا ہوتی تھی۔ یہ تعداد اتنی حیرت انگیز ہے

کہ اُن سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان علم کے کس قدر زیادہ شائق ہوتے تھے۔

یزید بن ہارون نے بغداد میں حدیث کا درس دیا تو اُن کی مجلس میں اندازاً ستر ہزار طالبانِ علم نے شرکت کی۔

امام عاصمؒ بن علی حدیث لکھوانے کے لیے بغداد سے باہر ایک چبوترے پر بیٹھتے تھے۔ ایک دفعہ وقت کے حکمران نے اپنا ایک آدمی وہاں بھیجا تا کہ اندازہ لگائے کہ اس مجلس میں کتنے طالبانِ علم شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اندازہ لگایا گیا تو وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے۔

امام مسلمؒ کی ایک مجلس میں شریک ہونے والے طالبانِ علم کی دواتوں کا اندازہ لگایا گیا تو کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئیں اور جو لوگ لکھ نہیں رہے تھے صرف سن رہے تھے، وہ اس تعداد کے علاوہ تھے۔

ایسے ہی کئی اور واقعات بھی ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ علمی مجالس میں حاضری بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔ یہ تو طالبانِ علم کا حال تھا۔ علم سکھانے والے علماء کی تعداد بھی واضح کیے دیتی ہے کہ مسلمانوں میں طلب علم کتنی زیادہ تھی۔ ایک ایک شہر میں سینکڑوں کی تعداد میں علماء مل جاتے تھے۔

مسلم بن ابراہیم کہتے ہیں کہ "میں نے آٹھ سو شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا اور باوجود شیوخ کی اس کثرت کے میں پل اتر کر نہیں گیا۔"

پل، جس کا یہاں ذکر ہے، اس کے بارے میں خیال ہے کہ شاید وہ دریائے دجلہ کا پل تھا جس کے کنارے بغداد آباد تھا۔ مسلم بن ابراہیم کا یہ کہنا کہ پل اترے بغیر میں نے آٹھ سو شیوخ سے علم حاصل کیا، کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف بغداد ہی کے اندر کم از کم آٹھ

سو علماء اس پائے کے موجود تھے۔ جن میں سے ہر ایک کے نام کے ساتھ "شیخ" لگا تھا۔

عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کو پتہ چلا کہ کسی طبیب کی جہالت کے باعث ایک شخص اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ انہوں نے رئیس الاطباء ابن ثابت کو حکم دیا کہ بغداد کے تمام طبیبوں کا امتحان لیا جائے' جو اس امتحان میں کامیاب ہوں اُنہیں لوگوں کا علاج کرنے کی اجازت دی جائے اور جو ناکام رہیں اُنہیں علاج کرنے سے روک دیا جائے۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا۔ اس امتحان میں جو طبیب پاس ہوئے اور جنہیں علاج کرنے کی اجازت دی گئی' اُن کی تعداد کچھ کم نو سو تھی۔ باقی رہے بغداد کے وہ طبیب جن کی شہرت اور فضل و کمال اس پائے کا تھا کہ انہیں امتحان میں شامل کرنا غیر ضروری سمجھا گیا' تو وہ اس تعداد کے علاوہ تھے۔ طبیبوں کی اس تعداد کا تعلق صرف ایک شہر بغداد سے تھا۔

علم کی قدر لوگوں کے دلوں میں اتنی تھی کہ کسی اچھے اُستاد سے محروم رہ جانا بہت بڑی محرومی شمار کی جاتی تھی۔ امام ابو العباس نے ایامِ طالب علمی میں اپنی والدہ سے درخواست کی کہ وہ انہیں مشہور عالم امام ابن قتیبہ کی خدمت میں جا کر علم حاصل کرنے کی اجازت دیں۔ والدہ نے اجازت نہ دی۔ جب والدہ رحلت فرما گئیں تو یہ امام قتیبہ کی شاگردی اختیار کرنے کے لیے بلخ پہنچے' مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ابن قتیبہ وفات پا چکے تھے۔ اس محرومی کو اتنا اہم سمجھا گیا کہ لوگ ابو العباس کے پاس تعزیت کے لیے آئے۔

امام اسمٰعیلی نے جب محمد بن ایوب رازی کی وفات کی خبر سنی تو روئے' چیخے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر پر خاک ڈالی۔ ان کی پریشانی دیکھ کر گھر والے جمع ہو گئے اور اس غم و اندوہ کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ تم لوگ مجھے سفر سے روکتے رہے آخر محمد بن ایوب وفات پا گئے۔ اب میں انہیں کہاں پاؤں گا۔

عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی علم دوستی کا یہ حال تھا کہ حدیث سننے کے لیے بغداد

سے چل کر مدینہ منورہ امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عام طلبہ کے ساتھ کھجور کے ایک تنے پر بیٹھ کر حدیث لکھتا رہا۔

☆ غلام اور نابینا علماء: اسلامی معاشرے میں یہ شوقِ علم صرف صحتمند اور آزاد لوگوں ہی میں نہیں پایا جاتا تھا بلکہ وہ لوگ بھی جو غلامی کے پنجے میں گرفتار رہ چکے تھے اور وہ بھی جو نگاہ سے محروم تھے، علم کے معاملے میں آنکھوں والوں اور آزاد و با اختیار لوگوں سے پیچھے نہیں تھے۔ مسلمان علماء کے موضوع پر لکھی ہوئی ایک کتاب "علمائے سلف اور نابینا علماء" میں بتیس نام ایسے علماء کے ملتے ہیں جو آنکھوں سے محروم تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اتنا علم حاصل کیا کہ بڑے بڑے علماء کی صف میں شمار کیے گئے۔ ان میں سے بعض اپنے اپنے فن میں ایسے باکمال ہوئے کہ آنکھوں والوں میں بھی اُن کی مثال کم ملتی ہے۔ انہوں نے بڑے پائے کی کتابیں تصنیف کی اور اُن کے شاگردوں میں بڑے بڑے باکمال علماء پیدا ہوئے۔ انہیں نابینا علماءؒ میں مشہور تابعی حضرت قتادہؒ کا نام بھی ہے۔ حضرت قتادہؒ حضرت سعیدؒ بن میتب کے شاگرد تھے۔ وہ اتنے شوق اور اتنی کوشش اور محنت سے علم حاصل کرتے تھے کہ ایک دن حضرت سعیدؒ بن میتب گھبرا کر پکار اُٹھے۔ "اے اندھے، تو یہاں سے نکل جا، تو نے تو مجھے نچوڑ لیا"۔

ایسے ہی علمائے اسلام میں وہ بزرگ بھی موجود تھے جنہوں نے غلام ہونے کے باوجود اپنے علمی فضل و کمال کے باعث لوگوں کے دلوں پر کامیاب حکمرانی کی۔ ان باکمالوں میں سے صرف دو نمایاں نام یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک حضرت نافعؒ بن کاؤس اور دوسرے حضرت عکرمہؒ۔

حضرت نافعؒ بن کاؤس حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، اس لیے نافع مولا ابن عمرؓ کہلاتے تھے۔ آپ کا علم و فضل بہت حد تک حضرت ابن عمرؓ ہی کی صحبت اور

تربیت کا نتیجہ تھا۔ حافظ ذہبی نے انہیں "امام العلم" کا لقب دیا تھا۔ حضرت ابن عمرؓ ان کے اتنے قدردان تھے کہ فرمایا کرتے کہ خدا نے نافعؒ کے ذریعے سے ہم پر احسان فرمایا ہے۔ امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں ابن عمرؓ کی کوئی حدیث نافعؒ کی زبانی سن لیتا ہوں تو پھر میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ کسی دوسرے کے بیان سے اُس کی تصدیق ہوتی ہے یا نہیں۔ آپ کی مراد یہ تھی کہ حضرت ابن عمرؓ اور نافعؒ کے واسطے سے بیان کی ہوئی حدیث کو میں بالکل درست سمجھتا ہوں۔

حضرت عکرمہؒ نسلاً بربری تھے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے غلام تھے۔ آپ کمسنی ہی میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس آ گئے تھے اور انہیں کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی تعلیم و تربیت نے انہیں اس درجے کو پہنچا دیا تھا کہ ان کی شخصیت بڑے بڑے آزاد علماء کے لیے باعثِ رشک تھی۔ وہ علم سے سیر نہیں ہوتے تھے۔ مسلسل چالیس برس تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ تفسیر' حدیث' فقہ جملہ علوم میں انہیں امامت کا درجہ حاصل تھا۔ علامہ ابن سعد اُن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ علم کے سمندر تھے۔" حافظ ذہبی انہیں حبر العالم یعنی دنیا کا فقیہہ کا لقب دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ تفسیر کے امام سمجھے جاتے تھے' انہوں نے بڑی کوشش اور محنت سے حضرت عکرمہؒ کو تفسیر پڑھائی تھی۔ علم حدیث کے طالب دُور دُور سے حضرت عکرمہؒ سے علم حاصل کرنے آتے تھے۔ جدھر سے وہ گزر جاتے شائقین کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ علم کے ایک طالب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ عکرمہؒ دنیا کے جس حصے میں بھی ملیں گے اُن کے پاس جاؤں گا۔ اسی دوران میں ایک دن بصرے کے بازار سے گزرا تو اتفاقاً عکرمہؒ وہاں مل گئے۔ لوگوں کی زبان پر اُن کا نام آنا تھا کہ ہر طرف سے لوگ اُن کے پاس جمع ہونے لگے۔ میں بھی قریب گیا' مگر ہجوم کی کثرت کی وجہ سے کچھ پوچھ نہ سکا۔ پھر میں اُن کی سواری کے

پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ لوگ اُن سے جو کچھ پوچھتے تھے اور وہ جو جواب دیتے تھے' وہ میں یاد کرتا جاتا تھا۔ یہی صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ عکرمہؒ ہمارے یہاں آئے تو اُن کے پاس لوگوں کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ انہیں مجبور ہو کر چھت پر چڑھ جانا پڑا۔

☆**علم دوست خواتین:** مردوں کے علاوہ خواتین میں بھی شروع سے علم کی پیاس موجود تھی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ عورتوں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ (آپؐ سے فائدہ اٹھانے میں) مرد ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ پس آپؐ اپنی طرف سے ہمارے لیے کوئی دن مقرر فرما دیجئے۔ پس حضورؐ نے اُن سے کسی دن کا وعدہ فرمایا جس میں آپؐ اُن سے ملے اور انہیں وعظ و نصیحت کی......(بخاری)

اسلامی علوم یعنی قرأت' تفسیر' حدیث' فقہ' فرائض میں متعدد صحابیات کمال رکھتی تھیں۔ ان میں حضرت عائشہؓ کا نام نامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپؓ کو تفسیر میں خاص نگاہ حاصل تھی۔ چنانچہ صحیح مسلم کے آخر میں ان کی تفسیر کا معتدبہ حصہ منقول ہے۔ چونکہ آپؓ حضورؐ کی صحبت میں رہیں۔ اس لیے آپ کی بیان کردہ احادیث کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ مردوں میں سے بھی صرف پانچ چھ ایسے ہیں جن کی بیان کردہ احادیث کی تعداد حضرت عائشہؓ سے زیادہ ہے۔ سب سے زیادہ احادیث حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان کیں۔ اُن کی احادیث پانچ ہزار تین سو چونسٹھ ہیں اور حضرت عائشہؓ کی احادیث دو ہزار دو سو دس ہیں۔ احادیث کی کثرت کے علاوہ آپؓ کی بیان کردہ روایات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جن احکام اور واقعات کو نقل کرتی ہیں اکثر ان کی وجوہ اور اسباب بھی بیان کرتی ہیں اور وہ خاص حکم جن مصلحتوں پر مبنی ہوتا ہے' اُن کی تشریح کرتی ہیں۔ تفسیر و حدیث کے علاوہ فقہ میں بھی آپ کی شہرت مسلم تھی اور آپ کا شمار مجتہد صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ مولانا سعید انصاری مؤلف سیر الصحابیات لکھتے ہیں کہ فقہ میں حضرت عائشہؓ کے فتوے اس قدر ہیں کہ متعدد ضخیم جلدیں

تیار ہو سکتی ہیں۔ پھر علم فرائض میں بھی آپ کو خاص نگاہ حاصل تھی۔ فرائض وہ علم ہے جو ورثے اور وارثوں سے بحث کرتا ہے۔ بڑے بڑے صحابہ حضرت عائشہؓ سے فرائض کے متعلق مسائل پوچھنے آیا کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ کے بعد حضرت اُم سلمہؓ کا نام مشہور ہے۔ آپؓ کی بیان کردہ احادیث کی تعداد تین سو ستر ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت اُم سلمہؓ کی ایک روایت آئی ہے کہ ایک دن ایک لڑکی میری کنگھی کر رہی تھی کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ ''اے لوگو!'' میں نے اس لڑکی سے کہا کہ مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ (تا کہ میں وہ باتیں سنوں جو حضورؐ بیان کرنے لگے ہیں) وہ کہنے لگی۔ حضورؐ نے تو صرف مردوں کو بلایا ہے عورتوں کو نہیں بلایا۔ میں نے جواب دیا کہ (حضورؐ نے لوگوں کو بلایا ہے اور) بے شک میں لوگوں میں سے ہوں۔ (مسلم)

محمود بن لبید کہتے ہیں۔

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات نے کثرت سے احادیث یاد کر رکھی تھیں۔ تاہم اُن میں (حضرت) عائشہؓ اور (حضرت) اُم سلمہؓ کی مثال نہیں تھی۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی حضرت سلمہؓ سے فیض حاصل کرتے تھے اور تابعین کے ایک بڑے گروہ نے اُن سے استفادہ کیا۔ فقہ میں آپ کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔

مشہور صحابیہ حضرت اُمّ الدرداءؓ بڑی علم و فہم والی خاتون تھیں۔ علم و فضل میں اُن کا درجہ اُونچا ہے۔ ایک دن حضرت عونؓ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اُن کے ہاں پہنچے اور دیر تک علمی گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہیں کچھ احساس ہوا اور حضرت ام الدرداءؓ سے معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ آپؓ ہماری گفتگو سے اُکتائی تو نہیں۔ فرمایا کہ عونؓ، کیا کہا؟ میرا تو ہر

کام شروع کرتے وقت عبادت کی نیت کر لیتی ہوں' لیکن علمی گفتگو تو میری اصل غذا ہے۔ یہ تو میرا بہترین مشغلہ ہے۔ جو لطف مجھے اس میں آتا ہے کسی چیز میں نہیں آتا۔

حضرت عائشہؓ نے جن خواتین کو تعلیم و تربیت دی' اُن میں پہلا نام عمرہ بنت عبدالرحمٰنؒ کا ہے۔ محدثین ان کا نام عظمت سے لیتے تھے۔ امام بخاری کی روایت کے مطابق وہ حضرت عائشہؓ کی میر منشی تھیں اور حضرت عائشہؓ کو ان سے بہت محبت تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ لوگ بھی اُن کی خاطر داری کرتے تھے۔ اُن کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ جب امام زہریؒ نے علمِ حدیث کی تحصیل شروع کی تو محدث قاسم بن محمد نے اُن سے کہا کہ تم میں علم کی بڑی حرص ہے اس لیے میں تم کو علم کے ظرف کا پتہ بتاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ضرور بتایئے۔ قاسم بن محمد نے کہا کہ تم عبدالرحمٰن کی لڑکی (یعنی عمرہ بنت عبدالرحمٰن) کے پاس جاؤ۔ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی ہے۔ امام زہریؒ کہتے ہیں۔ ''چنانچہ میں اُن کے پاس گیا۔ واقعی وہ علم کا ایک بیکراں سمندر تھیں۔''

مشہور مورخ حافظ ابن عساکر کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے جن اساتذہ سے علمِ حدیث حاصل کیا' اُن میں اسی سے زیادہ عورتیں تھیں۔

آزاد خاندانی عورتوں کے علاوہ کنیزوں میں بھی علم و فضل پایا جاتا تھا۔ ابن سماک کوفی نے' جو اپنے عہد کے مشہور عالم تھے--- ایک دفعہ کوئی تقریر کی اور پھر اپنی کنیز سے پوچھا کہ میرا طرزِ بیان کیسا تھا۔ اس نے کہا۔ تقریر تو اچھی تھی' مگر یہ نقص تھا کہ آپ ایک ہی بات بار بار کہتے تھے۔'' ابن سماک نے کہا کہ ''میں اس لیے ایسا کرتا ہوں کہ جو لوگ پہلی مرتبہ بات نہیں سمجھے وہ دوسری مرتبہ سمجھ جائیں۔'' لائق کنیز بولیں۔ ''جب تک کم فہم سمجھیں گے سمجھنے والے مکدر ہو چکے ہوں گے۔''

خواتین کی علم دوستی کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دلانے میں بہت

زیادہ دلچسپی لیتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک ہی مؤثر واقعہ بیان کر دینا کافی ہوگا۔

امام مالکؒ کے استاد امام ربیعہ الرائی پیدا ہونے والے تھے کہ اُن کے والد عبدالرحمٰن فروخ، جو لشکر میں ملازم تھے، فوج کے ساتھ خراسان کی طرف چلے گئے اور بیوی کو تیس ہزار اشرفیاں دے گئے۔ خراسانی مہم میں انہیں ستائیس سال لگ گئے۔ اس دوران میں ربیعہ کی علم دوست والدہ نے انہیں اتنا لکھایا پڑھایا کہ وہ امام وقت ہو گئے اور امام مالکؒ اور خواجہ حسن بصریؒ جیسے لوگ ان کے شاگرد تھے۔ ستائیس برس کے بعد جب فروخ گھر آئے تو آ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام ربیعہؒ نے دروازہ کھولا اور جب دیکھا کہ ایک اجنبی شخص گھر کے اندر داخل ہونا چاہتا ہے تو سخت ناراض ہوئے اور غصے سے کہا کہ او خدا کے دشمن، تو میرے مکان میں کیوں گھسا پڑتا ہے۔ فروخ نے بھی بیٹے کو نہیں پہچانا تھا، وہ بھی طیش میں آ گئے اور چلائے کہ ”او خدا کے دشمن، میری حرم سراء میں تیرا کیا کام۔“ جب جھگڑا بڑھا تو پاس پڑوس والے جمع ہو گئے، جن میں امام مالکؒ بھی تھے۔ انہوں نے فروخ سے کہا کہ بڑے میاں اگر مکان ہی درکار ہے تو اور مکان موجود ہیں۔ فروخ نے کہا کہ یہ مکان میرا ہے۔ اس دوران میں ان کی زوجہ محترمہ نے آواز سن لی اور آ کر دونوں کو بتایا کہ تم تو باپ بیٹے ہو۔ اس پر دونوں باپ بیٹے گلے ملے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ رات جب اطمینان سے بیٹھے تو فروخ نے بیوی سے ان تیس ہزار اشرفیوں کے بارے میں سوال کیا، جو وہ جاتی دفعہ دے گئے تھے۔ عقل مند بیوی نے کہا۔ ”تسلی رکھیے وہ حفاظت سے ہیں۔“

پھر جب فروخ مسجد میں پہنچے تو ربیعہ سر جھکائے اُونچی ٹوپی پہنے درس دے رہے تھے اور شاگردوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ فروخ پھر بیٹے کو پہچان نہ سکے اور کسی سے پوچھا کہ یہ شیخ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ربیعہ بن عبدالرحمٰن ہیں۔ فروخ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بے اختیار بول اُٹھے۔ لَقَدْ رَفَعَ اللّٰهُ اِبْنِی (خدا نے میرے بیٹے کی شان بلند

کی) شاداں وفرحاں گھر پہنچے تو اہلیہ محترمہ نے پوچھا کہ بیٹے کی یہ شان زیادہ پسند ہے یا تیس ہزار اشرفیاں۔ انہوں نے جواب دیا بیٹے کی یہ شان' اُن دانا خاتون نے کہا کہ بس آپ کی وہ اشرفیاں اس کی تعلیم پر خرچ ہوئی ہیں۔ فروخ نے جواب دیا۔ وَاللّٰهِ مَا ضَيَّعْتِهٖ (خدا کی قسم' تم نے وہ رقم ضائع نہیں کی) بعض جگہ لکھا ہے کہ فروخ کے اشرفیوں کے بارے میں سوال کرنے پر بیوی نے کہا کہ میں نے انہیں حفاظت سے زمین میں دفن کر رکھا ہے۔ پھر جب فروخ بیٹے کی شان دیکھ کر شاداں وفرحاں گھر پہنچے اور بیوی سے ذکر کیا' تو انہوں نے جواب دیا کہ یہی وہ زمین ہے جس میں میں نے وہ تیس ہزار اشرفیاں دفن کی تھیں۔

☆ علم کی راہ میں مشقتیں: طالبانِ علم نے علم کی راہ میں جو مشقتیں اٹھائیں وہ بھی گوناگوں تھیں۔ انہوں نے فقر وفاقہ کی مصیبتیں سہیں' لمبے لمبے سفر کیے' شدید سردی اور شدید گرمی کی تکالیف برداشت کیں مگر علم کا دامن نہ چھوڑا۔ کبھی ایسے بھی ہوتا تھا کہ کسی عالم کو حاکم وقت کی دشمنی کے باعث جان کے لالے پڑ جاتے اور جنگلوں صحراؤں میں چھپے چھپے رہنا پڑتا' مگر علم کی طلب وہاں بھی اُن کے ساتھ ہی رہتی۔ علم کی طلب اُن کے ہاں ایک ایسا مقصد تھا جو ہر طرح اس بات کا حق رکھتا تھا کہ اس کی خاطر مشقتیں برداشت کی جائیں۔ لہٰذا حصولِ علم کے سلسلہ میں تن آسانی کو پسندیدہ نہ سمجھا جاتا۔ ایک عالم کا ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک شب انہوں نے اپنے دو شاگردوں کو دو مختلف حالتوں میں پایا۔ ایک تکیے کا سہارا لیے کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا اور دوسرا دوزانوں مستعد بیٹھا کتاب بینی کر رہا تھا۔ استاد نے ٹیک لگا کر پڑھنے والے کے متعلق کہا۔

اِنَّهٗ لَا يَبْلُغُ دَرَجَةَ الْفَضْلِ۔ — یہ فضیلت کے درجے کو نہیں پہنچے گا۔

اور دوزانوں مستعد بیٹھ کر مطالعہ کرنے والے کے متعلق پیش گوئی کی۔

سَيُحَصِّلُ الْفَضْلَ وَيَكُوْنُ لَهٗ شَانٌ فِي الْعِلْمِ۔ — یہ فضل حاصل کرے گا اور اسے علم میں بڑی منزلت حاصل ہوگی۔

ظاہر ہے جن لوگوں کا علم کے بارے میں یہ نظریہ تھا' وہ حصولِ علم کی راہ میں کسی دقت اور رکاوٹ سے شکست کھانے والے نہیں تھے۔ امام شافعیؒ نے اپنی ابتدائی طالب علمی کا حال اس طرح بیان فرمایا ہے:

''میں یتیم بچہ تھا۔ ماں نے مکتب بھیجا' مگر گھر میں اتنا بھی نہ تھا کہ استاد کی کچھ خدمت کی جاتی۔ خوش قسمتی سے استاد اس بات پر راضی ہو گئے کہ جب وہ باہر جایا کریں گے تو میں لڑکوں کی نگرانی کیا کروں گا۔ اس طرح جب میرا قرآن ختم ہو گیا تو میں علماء کے حلقوں میں حاضری دینے لگا۔ جو بھی حدیث یا مسئلہ سن پاتا فوراً یاد ہو جاتا۔ میری ماں اس قدر غریب تھیں کہ کاغذ کی قیمت بھی نہیں دی سکتی تھی۔ مجبوراً میں چکنی ہڈیاں ڈھونڈتا پھرتا اور کوئی مل جاتی تو اُٹھا لیتا اور اس پر لکھنا شروع کر دیتا۔ جب وہ تحریر سے بھر جاتی اور لکھنے کے لیے جگہ نہ رہتی تو اُسے گھر کے ایک پرانے گھڑے میں احتیاط سے رکھ دیتا۔ اس طرح میری تعلیم چل رہی تھی کہ اتفاق سے یمن کا ایک گورنر مکہ مکرمہ آیا۔ بعض لوگوں نے میری سفارش کی اور وہ مجھے کام دینے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر میرے پاس اتنا بھی نہیں تھا کہ اپنی حالت درست کر کے گورنر کے ساتھ سفر کر سکتا۔ آخر والدہ صاحبہ نے اپنی چادر سولہ دینار میں رہن رکھ کر مجھے روپیہ دیا' تو میں گورنر کے ساتھ ہو لیا......

امام ابو یوسفؒ بیان کرتے ہیں۔ ''ہم نے اور ہمارے ساتھ بے شمار آدمیوں نے طالب علمی کی' لیکن فائدہ انہیں کو پہنچا جن کے دل دہی سے پک گئے تھے...... ہمارے گھر سویرے تڑکے دہی چپڑی روٹی تیار ہو جاتی تھی۔ ہم اس کا ناشتہ کر کے طلبِ علم میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ پھر لوٹتے تھے اور یہی روٹی کھا لیتے تھے لیکن چٹورے لڑکے اچھے اچھے کھانوں کی چاٹ میں رُکے رہتے تھے اور اس علم سے محروم رہ جاتے تھے جو اُن کی غیر حاضری میں ہمیں حاصل ہوا کرتا تھا۔''

حجاج بغدادی جب تحصیل علم کے لیے جانے لگے تو اُن کی والدہ نے سو کلچے پکا کر ساتھ کر دیے۔ کلچے تو ماں نے پکا دیے تھے' سالن انہوں نے خود سوچ لیا روز ایک کلچہ دریائے دجلہ کے پانی میں بھگو کر کھا لیتے اور اُستاد سے پڑھتے رہتے۔

امام برقانی جب علم حاصل کرنے نکلے تو پاس صرف تین اشرفیاں اور ایک درہم تھا۔ سوءِ اتفاق سے اشرفیاں راستے میں گم ہو گئیں اور صرف درہم رہ گیا منزلِ مقصود پر پہنچ کر انہوں نے وہ درہم ایک نان بائی کے پاس جمع کرا دیا اور روز اس سے دو روٹیاں لے لیتے اور ایک کتاب کا ایک جزء شام تک نقل کرتے رہتے' اس طرح تیس جزء ختم کیے تو وہ درہم ختم ہو گیا۔ امام ابو علی بلخیؒ ایک دفعہ خرچ سے اتنے تنگ ہوئے کہ فاقوں پر فاقے آنے لگے۔ یہاں تک کہ کمزوری کے باعث لکھنے سے بھی معذور ہو گئے۔ اس حالت میں ایک نان بائی کی دکان پر اس غرض سے جا بیٹھے کہ کھانے کی خوشبو ہی سے کچھ قوت حاصل کر لیں۔

فن حدیث کے عالی مرتبہ امام ابو حاتم رازی اپنا قصہ خود بیان کرتے ہیں۔ کہ زمانہ طالب علمی میں ایک وقت تنگ دستی کی یہ نوبت پہنچی کہ کپڑے تک بیچ دیے۔ جب یہ پیسے بھی ختم ہو گئے تو دو دن بھوکا رہا۔ آخر ایک رفیق سے حال بیان کیا۔ اس کے پاس ایک اشرفی تھی جو اس نے نصف مجھے دے دی۔

ابو العلاء ہمدانی کو ایک دفعہ بغداد میں اس حال میں دیکھا گیا کہ مسجد کے چراغ کے پاس کھڑے تھے۔ چراغ بلندی پر تھا۔ اس لیے وہ کھڑے کھڑے اس کی روشنی میں لکھ رہے تھے۔ ایسے ہی حکیم ابو نصر فارابی کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں چراغ کے لیے تیل خریدنے سے معذور ہونے کے باعث پاسبانوں کی قندیلوں کی روشنی میں پڑھا کرتے تھے۔

امام مالکؒ کا قول ہے۔ ''یہ علم حاصل نہیں ہو سکتا' جب تک اس کی راہ میں فقر و

فاقے کی لذت نہ چکھی جائے۔"

سحنوں کا مقولہ ہے۔ "علم اسے راس نہیں آتا جو پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔"

امام شافعیؒ کہا کرتے تھے۔ "جو شخص دولت کے زور اور خودی کے گھمنڈ میں طالب علمی کرتا ہے' ناکام رہے گا۔ البتہ جس نے خاکساری' تنگ دستی اور احترامِ علم کے ساتھ طالب علمی کی' وہ کامیاب ہوگا۔"

یہ تو فقر و فاقہ کی بات تھی' طلبِ علم میں علماء نے سفر کی صعوبتیں بھی اتنی زیادہ برداشت کیں کہ علم کے ایک عام شائق سے اس کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

شروع شروع میں علم کے لیے سفر کرنے کا رواج علمِ حدیث کی خاطر ہوا تھا۔ پھر دوسرے علوم کے لیے بھی سفر کیے جاتے رہے۔ امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک ایک حدیث کو حاصل کرنے کی خاطر میں راتوں اور دنوں پیادہ پا چلا ہوں۔

صحیح بخاری کے عالی مقام مؤلف امام بخاریؒ نے چودہ برس کی عمر میں سفر شروع کر دیے تھے۔ ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ بخارا سے لے کر مصر تک تمام ممالک ان کی سیاحت کی فہرست میں موجود ہیں۔

اندلس (سپین) کے ایک محدث کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے اُندلس' عراق' حجاز اور یمن کے شیوخ سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ یہ کہیں ذکر نہیں کہ آیا وہ خشکی کے راستے آئے یا پانی کے راستے۔ اگر وہ خشکی کے راستے آئے ہوں گے' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سپین سے شمالی افریقہ میں آئے ہوں گے۔ پھر سارا شمالی افریقہ طے کر کے ایشیا میں داخل ہوئے ہوں گے اور یہاں عراق' حجاز اور یمن تک پہنچے ہوں گے اور اگر انہوں نے بحری راستہ اختیار کیا ہوگا تو پھر انہوں نے سارا بحر روم عبور کیا ہوگا اور پھر بحرِ احمر کا سفر بھی کیا ہوگا۔

ابن المقری بیان کرتے ہیں کہ ایک کتاب حاصل کرنے کی خاطر انہوں نے ستر منزل کا سفر کیا تھا۔اس کے علاوہ اُن کے متعلق یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے مشرق (یعنی ممالک ایشیا) اور مغرب (یعنی ممالک افریقہ وسپین) کا چار مرتبہ سفر کیا تھا۔

یہ ذوق صرف آنکھوں والوں ہی میں نہ تھا بلکہ مادر زاد نابینا حافظ الحدیث ابوالعباس رازی کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے احادیث کی تلاش میں بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر کیا۔

حافظ ابوعبداللہ اصفہانی ایک دفعہ بتانے لگے کہ حدیث کی تلاش میں انہوں نے کس کس مقام کا سفر کیا اور جن جن مقامات کا انہوں نے ذکر کیا، ان کی کل تعداد ایک سو بیس تھی۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ یہ داستان تو بہت دراز ہے۔مگر ان سطور میں مزید لکھنے کی گنجائش نہیں، اس لیے اتنے ہی واقعات لکھنے پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔



علم کی قدردانی

یہ بھی شوقِ علم ہی کا ایک حصہ تھا کہ اسلامی معاشرے میں علم والے لوگوں کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ طبرانی' حاکم اور بیہقی وغیرہ محدثین نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ کاتبِ وحی حضرت زیدؓ بن ثابت ایک دفعہ کسی جنازے میں شامل ہوئے۔ نماز کے بعد جب سواری پر سوار ہونے لگے تو حضرت عبداللہ بنؓ عباسؓ نے رکاب تھام لی۔ حضرت زیدؓ نے کہا کہ اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی' رکاب چھوڑ دیجئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ عالموں اور بڑوں کی تعظیم اس طرح کریں۔ اس پر حضرت زیدؓ نے ابن عباسؓ کا ہاتھ چوم لیا اور فرمایا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کا احترام اس طرح کریں۔

علم کی یہ قدردانی بعد کے زمانوں میں بھی قائم رہی۔ خواص ہی نہیں بلکہ عوام بھی اہلِ علم پر فدا ہوئے جاتے تھے اور علم سے تعلق رکھنے والے طبقات کے علاوہ تاجر اور کاروباری لوگ بھی علماء کی قدردانی کرنے میں پیچھے نہیں رہتے تھے۔ ذیل کے واقعات واضح کیے دیتے ہیں کہ عوام وخواص سب کے دلوں میں علم اور اہلِ علم کی کتنی عزت اور محبت تھی۔

امام بخاریؒ جب علم حاصل کر کے اپنے وطن بخارا کو آئے تو اہل بخارا نے نہایت جوش وخروش سے ان کے استقبال کی تیاریاں کیں۔ شہر سے تین میل کے فاصلے پر خیمے لگائے گئے اور تمام اہل بخارا ان کے استقبال کے لیے آگے آئے یہاں تک کہ کوئی قابلِ ذکر شخص شہر میں نہ رہا۔ پھر اس شان سے اُنہیں شہر میں لایا گیا کہ روپے اور اشرفیاں اُن کے

سر پر سے نچھاور کی جاتی تھیں۔ ایسے ہی جب وہ شہر نیشاپور گئے تو اہلِ شہر نے ان کا زبردست استقبال کیا۔ امام مسلم بیان کرتے ہیں کہ نیشاپور کے لوگوں نے جب امام بخاریؒ کے آنے کی خبر سنی تو بعض نے دو منزل اور بعض نے تین منزل آگے جا کر اُن کا استقبال کیا اور شہر میں وہ جس شان سے داخل ہوئے وہ شان میں نے کسی حاکم یا عالم کی آمد پر نہیں دیکھی۔

ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید کا لشکر شہر رقہ میں خیمہ زن تھا۔ اتفاق سے اسی موقع پر امام حدیث حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا بھی وہاں گزر ہوا۔ ان کے استقبال کے لیے اس قدر لوگ جمع ہوئے کہ افق پر غبار چھا گیا اور کشمکش میں لوگوں کی جوتیاں پارہ پارہ ہو گئیں۔ خلیفہ کی ایک کنیز نے یہ سارا ہنگامہ دیکھا تو حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ خراسان کے عالم حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اس شہر میں تشریف لائے ہیں اور یہ سارا ہجوم ان کے لیے جمع ہو رہا ہے۔ اس پر وہ کنیز بے ساختہ کہہ اُٹھی۔ ”خدا کی قسم، حکومت اس کو کہتے ہیں۔ ہارون کی کیا حکومت ہے جس کے لیے لوگ اہل کاروں کے زور اور دباؤ کے باعث جمع ہوتے ہیں۔“

ایک شاعر نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی شان میں قصیدہ لکھا جس کے دو شعروں کا ترجمہ درج ذیل ہے:

جب ایک رات عبداللہؒ (شہر) مَرو سے چلے تو مرو کی ساری روشنی اور رونق جاتی رہی (اے عبداللہ) جب کسی شہر میں نیک عالموں کے تذکرے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب تو ستارے ہیں اور آپ اُن میں چاند کی طرح چمکتے ہیں۔“

حضرت زید بن اسلم تابعی غلام تھے، مگر ان کی علمی جلالت کے باعث سب پر اُن کی ہیبت چھائی رہتی تھی۔ آپ کا رُعب اس قدر تھا کہ لوگوں کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، مگر اس کے باوجود لوگوں کے دلوں میں آپ کی بے پناہ محبت تھی۔ آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ میرے والد کبھی کبھی مجھے اپنے کسی جلیس کے پاس کام سے بھیجتے تھے۔ وہ میرا سر چومتے اور سہلا کر کہتے خدا کی قسم، تمہارے والد مجھے اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ اگر خدا ان دونوں میں سے کسی ایک کو

اٹھانا چاہے اور ہم کو انتخاب کا اختیار دے تو ہم زید کی زندگی اور سلامتی کے مقابلے میں اپنی اولاد اور اپنے اہل وعیال کا اٹھ جانا پسند کریں گے۔ ابو حازم دعا کیا کرتے تھے کہ خدایا' مجھے زید کی موت کا دن نہ دکھانا۔ ان کے سوا میری ذات اور میرے مذہب کے لیے کوئی پسندیدہ اور نفع بخش باقی نہیں رہا ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ زید بن اسلم صالح تابعی تھے۔ ان کو ایک نظر دیکھ لینے سے عبادت کی قوت پیدا ہوتی تھی۔ ابو حازم کہتے تھے۔ ''خدایا' تو خوب جانتا ہے کہ میں زید کو اس لیے دیکھتا ہوں کہ اُن کو دیکھنے سے تیری عبادت کی طاقت آتی ہے۔''

جب امام طاؤس تابعیؒ نے وفات پائی اور آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ جنازہ کسی طرح نہ نکل سکا۔ آخر حاکمِ وقت نے فوج بھیجی اور فوج کے اہتمام سے جنازہ نکلا۔ حضرت عبداللہ بن حسن جنازہ اٹھائے ہوئے تھے۔ لوگوں کی کشمکش سے اُن کا لباس پارہ پارہ ہو گیا۔

امام سفیان بن عیینہ جب کوفے میں تشریف لائے تو امام ابو حنیفہؒ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تمہارے شہر میں (راوی حدیث) عمرو بن دینار کے علم کا حافظ آیا ہے۔ یہ بات سنتے ہی اہلِ کوفہ کا وہ حال ہوا کہ جوق در جوق امام ابن عیینہؒ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے تا کہ اُن سے احادیث سنیں۔ واضح رہے کہ اس وقت امام ابن عیینہؒ کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے مجھے اول محدث بنایا وہ امام ابو حنیفہؒ ہیں۔

امام غزالیؒ کے استاد امام الحرمین کو سلجوقی سلطنت میں سب سے بڑا دینی اعزاز حاصل تھا۔ آپ نیشاپور کے خطیب' سلطنت کے اسلامی اوقات کے ناظم و نگران اور مشہور درسگاہ مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس تھے۔ اُن کے اثر و رسوخ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان کرا دیا۔ امام الحرمین کا خیال تھا کہ چاند نہیں نکلا۔ چنانچہ انہوں نے منادی کرا دی کہ کل تک رمضان ہے' جو شخص میرے فتوے پر عمل کرنا چاہے وہ کل بھی روزہ رکھے۔ ملک شاہ نے اس پر باز پرس کی تو فرمایا کہ جو امور بادشاہ کے احکام پر موقوف ہیں ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔ مگر جو حکم فتویٰ سے تعلق رکھتے ہیں' وہ بادشاہ کو مجھ

سے پوچھنا چاہیے...... روزہ رکھنا عید کرنا' یہ امور فتویٰ پر موقوف ہیں۔ بادشاہِ وقت کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اعلان کروادیا کہ "میرا حکم درحقیقت غلط تھا اور امام الحرمین کا حکم صحیح ہے۔"

اس سب جاہ وجلال اور فضل وکمال کے باوجود امام الحرمینؒ خود بھی علم کے اتنے قدردان تھے کہ جب شیخ ابواسحٰق شیرازی کو خلیفہ بغداد نے کسی کام سے خراسان بھیجا تو جب وہ خراسان سے لوٹنے لگے تو امام الحرمین نے اُن کے گھوڑے کی رکاب تھام لی۔ خراسان میں اس کا یہ اثر ہوا کہ شیخ ابواسحٰق شیرازی کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی مٹی کو بھی تبرک کے طور پر اٹھایا گیا۔

خواجہ حسن بصریؒ اپنے علم وفضل کی وجہ سے عوام الناس میں بے انتہا مقبول تھے۔ ایک دن بنوامیہ کے گورنر حجاج بن یوسف نے خالد بن صفوان سے پوچھا کہ بصرے کا سردار کون ہے؟ خالد نے جواب دیا کہ حسن۔ حجاج نے حیران ہو کر کہا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ حسن تو غلاموں کی اولاد ہے۔ خالد نے جواب دیا کہ حسن اس لیے سردار ہیں کہ لوگ اپنے دین میں اُن کے محتاج ہیں اور وہ ان کی دنیا میں کسی کے محتاج نہیں۔ خدا کی قسم' میں نے بصرے میں کسی عزت دار کو نہیں دیکھا جو حسن کے حلقے میں پہنچنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ سب کو اُن کا وعظ سننے اور اُن سے علم حاصل کرنے کی آرزو رہتی ہے۔" یہ سن کر حجاج بولا۔ "خدا کی قسم' یہی سرداری ہے۔!

امیر معاویہؓ حج کے موقع پر میدان میں بیٹھے تھے اور ساتھ اُن کی اہلیہ بھی تھیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ اونٹوں پر چلے آرہے ہیں اور ایک نوجوان گا رہا ہے۔

"میرا رنگ گندمی ہے' جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے کہ میں عرب کے خوشحال ترین خاندان سے ہوں' جو میری سیالی کرتا ہے وہ ایسے سخی دل کی سیالی کرتا ہے جو ڈول کو منہ تک بھر دیتا ہے۔"

امیر معاویہؓ نے پوچھا کہ "یہ کون ہے؟" انہیں بتایا گیا کہ "یہ (حضرت علیؓ کے بھائی) جعفرؓ بن ابی طالب کی اولاد ہے۔" امیر معاویہؓ نے کہا کہ "راستہ چھوڑ دو' جانے دو۔" کچھ دیر کے بعد پھر آدمیوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ اس میں ایک لڑکا گا رہا تھا۔

"نازنینوں میں میرا چرچا ہو رہا تھا کہ محبوبہ نے دیکھ لیا کہ گھوڑا مجھے اُڑائے لیے جا رہا ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسری سے کہنے لگیں کہ اس بانکے نوجوان کو جانتی ہے۔ جواب ملا۔ ہاں ہاں، چاند بھی کبھی چھپتا ہے"!

امیر معاویہؓ نے پھر پوچھا کہ "یہ کون ہے؟" بتایا گیا کہ "یہ محمد بن عبداللہ بن ابی ربیعہ ہے۔" امیر معاویہؓ نے کہا کہ "راستہ چھوڑ دو، جانے دو۔" پھر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ہے اور اس کے گرد لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے جو اس سے مسائل دریافت کر رہے ہیں۔ امیر معاویہؓ نے پھر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تو انہیں بتایا گیا کہ یہ (صحابی رسولؐ) حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ ہیں۔ یہ سن کر امیر معاویہؓ اپنی بیوی سے کہنے لگے۔ "یہی شرف ہے، خدا کی قسم، دنیا اور آخرت کا یہی شرف ہے۔!"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا طریقہ تھا کہ ہمیشہ علماء سے مشورہ لیتے تھے۔ علماء سے محبت رکھتے تھے اور علماء کو مقرب بارگاہ بناتے تھے۔ خواجہ حسن بصریؒ کے بارے میں اُن کی رائے نہایت عمدہ تھی۔ ایک دفعہ انہوں نے عدی بن ارطاۃ کو، جو ہمیشہ شرعی امور میں اُن سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھا:

"خدا کی قسم، حسن بصریؒ تمہارے لیے کافی ہیں۔ جب یہ خط پہنچے تو میرے لیے، اپنے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے انہیں سے استفسار کیا کرو۔ خداوند تعالیٰ حسن بصریؒ پر رحم فرمائے کہ وہ اسلام میں ایک بڑے درجے کے شخص ہیں!"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ علماء کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ایک بار ایک شخص کو کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لیے سعیدؒ بن میتب کے پاس بھیجا۔ وہ مسئلہ پوچھ کر چلے آنے کے بجائے حضرت سعید بن میتب کو بلا لایا۔ جب وہ تشریف لائے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ قاصد نے غلطی سے آپ کو تکلیف دی، ہم نے تو صرف یہ کہا تھا کہ آپ سے مسئلہ پوچھ کر چلا آئے۔

خواجہ ناصر الدین عبیداللہ جب سمرقند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو بیمار طلبہ کی تیمارداری اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ جب اُن کے کپڑے اور بستر وغیرہ خراب ہو جاتے تو آپ اپنے ہاتھوں سے اُنہیں دھوتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ علم حاصل کرنے والوں کی

خدمت کرنے میں بڑا اجر ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تالیف "تاریخ دعوت وعزیمت" میں شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کے حالات لکھتے ہوئے ایک حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے جس سے اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اہلِ علم کی ہردلعزیزی اور رعب وداب کس مقام پر پہنچ چکا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اُن امرائے سلطنت کو نیلام کیا جو اُن کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے اور شرعی طریقے پر آزاد نہیں کیے گئے تھے۔ یہ امراء نسلاً ترک تھے اور مصر کی سلطنت پر بہت حاوی تھے۔ اُن میں ایک نائب السلطنت تھا۔ شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقے پر آزاد نہ ہوں اُن کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں اور وہ بھی عام غلاموں کے حکم میں ہیں۔ اُن کے فتوے کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اُن امراء کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کر دی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے۔ یہ دیکھ کر اُن امراء کے حلقے میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی۔ انہوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے اور اور شرعی طریقے پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا۔ انہوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں اور سرِ بازار نیلام کرنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا۔ اس گفت و شنید میں بادشاہ کے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا' جو شیخ کے خلافِ شان تھا۔ بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملے سے کیا تعلق اور وہ امراء کے قصے میں کیوں پڑتے ہیں۔ شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے اور انہوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کر لیا۔ اپنا سامان جانوروں پر بار کیا اور گھر والوں کو سوار کیا اور روانہ ہو گئے۔ اُن کی روانگی کی خبر سن کر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی۔ شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ اُن کے پیچھے ہو لیا۔ علماء' صلحا' تجار سب اُن کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔ سلطان کو اطلاع ہوئی اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عزالدین چلے گئے تو تمہاری سلطنت خالی رہے گی۔ سلطان خود سوار ہو کر اُن کے پاس پہنچا اور اُن کو منا کر شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ امرائے سلطنت کا وہ خود نیلام کریں۔ یہ سن کر نائب

السلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجے میں اُن کو اس ارادے سے باز رکھنا چاہا' لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ نائب السلطنت کو غصہ آ گیا اور وہ کہنے لگا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا۔ ہم ملک کے حاکم ہیں۔ خدا کی قسم' میں اس تلوار سے اس کی گردن اُڑا دوں گا۔ چنانچہ وہ اپنے عملے کے ساتھ سوار ہو کر شیخ کے دروازے پر پہنچا۔ ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا' شیخ کے صاحبزادے باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ لیے دروازے پر کھڑا ہے۔ انہوں نے اندر جا کر شیخ سے یہ حال کہا۔ شیخ نے بے پرواہی سے جواب دیا کہ بیٹا' تمہارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکلے۔ اُن کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گی اور اس کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اس نے رو کر شیخ سے دعا کی درخواست کی اور کہا کہ میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا کہ میں تمہارا نیلام کروں گا اور تمہیں فروخت کروں گا۔ اس نے کہا کہ آپ ہماری قیمت کس مد میں صرف کریں گے؟ فرمایا' مسلمانوں کے کاموں میں۔ اس نے عرض کیا کہ قیمت کون وصول کرے گا؟ فرمایا' میں خود۔ اس نے کہا۔ بہت اچھا۔ چنانچہ شیخ نے ایک ایک کر کے سب امراء کو نیلام کیا۔ سب پر بولی بولی۔ شیخ نے ان کے اعزاز کے طور پر اُن کے دام بہت لگائے اور بہت بڑی بولی پر اُن کو فروخت کیا اور قیمت وصول کر کے خیر کے کاموں میں صرف کی اور وہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر گئے۔ (مشہور عالم) امام ابن السبکی لکھتے ہیں کہ "یہ واقعہ کسی اور کے بارے میں سننے میں نہیں آیا۔" ایک عالم کی عظمت اور اس کے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عز الدین نے ۸۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ الملک الظاہر بیبرس کا عہد حکومت تھا۔ اس کو شیخ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ جنازے میں امرائے دربار ارکانِ سلطنت اور افواجِ شاہی بھی شریک تھیں۔ سلطان نے خود کاندھا دیا اور دفن میں شریک ہوا۔ شیخ کے جنازے کا اژدھام دیکھ کر سلطان نے اپنے خواص میں سے کسی سے کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے اس لیے کہ یہ شخص لوگوں میں اتنا مقبول تھا کہ اگر اشارہ کر دیتا تو میری سلطنت چلی جاتی۔



علم کی اشاعت

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن حزم کو ایک فرمان بھیجا' جس میں احادیث لکھ لینے کا حکم دیا۔ اس میں یہ بھی فرمایا:

''......چاہیے کہ لوگ علم کی اشاعت کریں اور (دوسروں کو علم سکھانے کے لیے) بیٹھیں تاکہ جو علم نہیں رکھتا اسے علم سکھا دیا جائے۔ کیونکہ علم چھپا رہنے ہی سے ختم ہوتا ہے۔ (بخاری)

حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت تک عام نہیں ہوسکتا' جب تک انسان علم حاصل کرنے کے علاوہ علم پھیلانے اور اُسے دوسروں تک پہنچانے کی فضیلت اور ضرورت کا بھی گہرا احساس نہ رکھتا ہو۔ جس طرح علم حاصل کرنا فضیلت اور اجروثواب کا باعث ہے' اسی طرح علم پھیلانا بھی ایسا صدقہ جاریہ ہے جس کے اجروثواب کا اندازہ لگانا بھی محال ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان جب کسی ایک شخص کو کوئی مفید علم دیتا ہے تو وہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس ایک شخص کے ذریعے آگے کتنے اور لوگ اس نافع علم کو حاصل کر کے اس کے لیے اجروثواب لانے کا باعث بنیں گے۔ اس لیے کہ اسلام میں اس بات کو صاف کر دیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی اچھائی کا آغاز کیا تو آگے وہ اچھائی جہاں تک بھی پھیلتی جائے گی اُس پہلے کو اس کے اجروثواب میں سے حصہ ملتا رہے گا۔ لہٰذا حصولِ علم کی تاکید کے ساتھ اشاعت علم ی

تاکید بھی آئی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "عنقریب تمہارے پاس لوگ آئیں گے جو علم کی تلاش میں ہوں گے۔ سو جب تم انہیں دیکھو تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق انہیں مرحبا مرحبا کہنا اور انہیں علم سکھانا۔" (ابن ماجہ)

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم (مجھ سے) سنتے ہو اور لوگ تم سے سنیں گے اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہو گا اُن سے اور لوگ سنیں گے۔" (ابوداؤد)

حضرت زیدؓ بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میری کوئی بات سن کر اُسے یاد رکھا' پھر اس کو (کسی اور تک) پہنچا دیا' کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سمجھ کی بات کو ایسے انسانوں تک پہنچا دیتے ہیں جو اُن سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں اور بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں سمجھ کی بات معلوم ہوتی ہے مگر وہ سمجھدار نہیں ہوتے۔ (ابوداؤد)

مراد یہ ہے کہ علمِ دین کی اشاعت کرنا بہت فضیلت کی بات ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ لوگوں کی عقل اور سمجھ کے درجے مختلف ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ علم کی کوئی بات کسی ایسے انسان کے پاس ہو جو خود زیادہ سمجھدار نہ ہو۔ مگر جب وہ اس کی اشاعت کرے گا تو عین ممکن ہے کہ یہ بات کسی ایسے انسان تک پہنچ جائے جو پہنچانے والے شخص سے زیادہ سمجھ دار ہو اور وہ اس بات کو بہ نسبت پہلے شخص کے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور یہ شے خود اس کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی زیادہ فائدہ مند ثابت ہو۔

سید علی ہجویریؒ علم کے ذریعے لوگوں کو فائدہ پہنچانے ہی کو حصولِ علم کا اصل مقصد

قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"علم کو مکمل طور پر پڑھ‘ اس پر عمل پیرا ہو اور اپنے علم سے خلقِ خدا کو بھی زیادہ سے زیادہ مستفید کر کہ یہی علم کا اصل مقصد و منشا ہے۔"

بصرے کے مشہور عالم حضرت ابو قلابہؒ فرماتے ہیں کہ عالم تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ عالم جو اپنے علم سے خود تو زندگی حاصل کر لیتے ہیں مگر دوسروں کو ان کے علم سے کوئی زندگی نہیں ملتی۔

دوسرے وہ عالم جن کے علم سے دوسرے لوگ تو زندگی حاصل کرتے ہیں لیکن وہ خود محروم رہتے ہیں۔

تیسرے وہ عالم جس نے اپنے علم سے خود بھی زندگی پائی اور اس کے علم سے دوسروں نے بھی زندگی حاصل کی۔

اس بیان سے مقصود علم پر عمل کرنے اور علم کی اشاعت کرنے کی اہمیت بتانا ہے۔ جو عالم خود زندگی حاصل کرتے ہیں مگر دوسرے ان کے علم سے زندگی حاصل نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے علم حاصل کیا اور اس پر عمل کر کے اپنی دنیوی زندگی اور اخروی زندگی دونوں کو سنوار لیا۔ مگر انہوں نے اپنے علم کو دوسروں تک نہ پہنچایا‘ لہٰذا دوسرے ان کے علم سے فائدہ حاصل کر کے اپنی زندگی نہ سنوار سکے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنہوں نے علم حاصل کیا مگر اس پر عمل نہ کیا۔ تاہم اس کی اشاعت کرتے رہے۔ چونکہ انہوں نے خود عمل نہیں کیا تھا‘ اس لیے اُن کی اپنی زندگی تو نہ سنور سکی‘ مگر دوسروں تک علم پہنچاتے رہنے کے باعث وہ دوسروں کے لے مفید ثابت ہوئے۔ جنہوں نے ان سے علم حاصل کر کے اور اس پر عمل کر کے اُن زندگیاں سنوار لیں۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنہوں نے علم حاصل کر کے اس پر عمل بھی کیا اور اس

کی اشاعت بھی کی۔ چنانچہ ان کے علم نے خود ان کی زندگی کو بھی سنوارا اور دوسروں نے بھی ان سے علم حاصل کر کے اپنی زندگیوں کو سنوار لیا۔

مشہور زاہد حضرت فضیلؒ بن عیاض فرمایا کرتے تھے۔

علم کے پانچ درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان خاموش رہنا سیکھے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ توجہ سے سننا سیکھے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ سنے اُسے یاد رکھے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ معلوم ہو جائے اس پر عمل کرے۔

اور پانچواں درجہ یہ ہے کہ جو علم حاصل ہو اُس کو پھیلائے۔

سورۃ الانبیاء آیت ۴۷ میں ارشاد ہوا ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ...... "قیامت کے روز ہم ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے۔"

امام ابوحنیفہؒ نے حماد بن ابراہیمؒ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ:

"قیامت کے دن آدمی کا عمل ترازو کے ایک پلے میں رکھا جائے گا اور وہ اونچا ہو جائے گا اور پھر ابر جیسی ایک چیز لائی جائے گی اور ترازو کے دوسرے پلے میں رکھ دی جائے گی اور وہ جھک جائے گا' تب آدمی سے کہا جائے گا کہ کیا تو جانتا ہے کہ یہ کیا ہے تو وہ انکار کرے گا' تو کہا جائے گا کہ یہ اس علم کی فضیلت ہے جو تو لوگوں کو سکھایا کرتا تھا۔"

سلیم بن عامر کہتے ہیں کہ حضرت ابوامامہ جب ہمیں بہت سی حدیثیں سنا چکتے تو سوال کرتے کہ کیا تم سمجھ گئے ہو۔ ہم عرض کرتے کہ جی ہاں' خوب سمجھ گئے ہیں۔ تو پھر فرماتے کہ اچھا پھر جاؤ اور یہ علم دوسروں کو اسی طرح پہنچا دو جس طرح ہم نے تمہیں پہنچایا

ہے۔ سلیم بن عامر کہتے ہیں کہ حضرت ابوامام کو اس بات کا بڑا اہتمام ہوتا تھا کہ ہم جو کچھ سنیں اس کی اشاعت بھی کرتے رہیں۔

ابراہیم بن اشعب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت فضیل بن عیاض سے پوچھا کہ مصیبت پر صبر کرنے کے معنی کیا ہیں' تو فرمایا' یہ کہ شکوہ نہ کرو۔

زہد کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ زہد قناعت ہے اور یہی تونگری ہے' ودورع (پرہیز گاری) کے بارے میں دریافت کیا' تو فرمایا۔ حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنا ورع ہے۔ خاکساری کا مطلب دریافت کیا تو فرمایا کہ خاکساری یہ ہے کہ حق کے آگے جھک جاؤ۔ کسی سے بھی حق ملے قبول کرلو' چاہے وہ کسی جاہل ترین انسان ہی سے کیوں نہ ملے۔ اور فرمایا کہ اپنا علم جاہلوں کو دو اور عالموں کا علم خود لو' اس طرح تمہارا علم محفوظ رہے گا اور تمہاری جہالت دُور ہوگی۔

اشاعتِ علم کی اہمیت کے پیش نظر مثالی حکمران ہمیشہ رعایا میں علم عام کرنے پر خصوصی زور دیتے رہے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اسلامی سلطنت میں ہر جگہ قرآن مجید کا درس جاری کیا اور معلم اور قاری مقرر کیے' جن کا یہی کام تھا کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ حضرت ابو الدرداءؓ دمشق میں اس خدمت پر مامور تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے شاگردوں کو شمار کرایا تو سولہ سو طالب علم ان کے حلقہ درس میں موجود تھے۔ قرآن مجید کی اشاعت کو زیادہ کرنے کے لیے حضرت عمرؓ نے ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ بعض سورتیں معین کر دیں کہ لوگ کم از کم ان سورتوں کو ضرور سیکھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سورتیں البقرۃ' النساء' المائدہ اور سورۃ النور تھیں۔ کیونکہ ان میں احکام وفرائض مذکور ہیں۔ حضرت عمرؓ اہلِ فوج کو جو ضروری ہدایات لکھ کر بھیجا کرتے تھے' ان میں ایک یہ حکم بھی ہوتا تھا کہ قرآن مجید پڑھنا سیکھیں۔ وقتاً فوقتاً افسروں سے قرآن پڑھنے والوں کا رجسٹر منگواتے رہتے تھے تاکہ

پتہ چلے کہ کتنے لوگ پڑھ رہے ہیں۔ ان تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار لوگ قرآن پڑھ گئے۔ عام پڑھنے والوں کا تو شمار ہی نہ تھا' حافظوں کی تعداد بھی سینکڑوں ہزاروں تک پہنچ گئی۔ جب حضرت عمرؓ نے فوجی افسروں کو حکم بھیجا کہ حافظوں کو میرے پاس بھیج دو تا کہ میں انہیں قرآن کی تعلیم دینے کے لیے جابجا بھیجوں تو حضرت سعد بن ابی وقاص نے لکھا کہ صرف میری فوج میں تین سو حافظ موجود ہیں۔

قرآن کی تعلیم کے ساتھ ہر جگہ تاکیدی احکام بھیجے گئے کہ ساتھ ساتھ صحتِ اعراب کی تعلیم بھی دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے ادب اور عربیت کی تعلیم بھی لازمی کردی تا کہ لوگ اعراب کی صحت اور غلطی کی تمیز کرسکیں۔ جو مکاتب جاری کیے گئے' اُن میں کتابت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

لوگوں کو فقہ کی تعلیم دینے کے لیے حضرت عمرؓ نے مختلف طریقے اختیار کیے۔ ہر اک شہر میں فقہاء کو متعین کیا کہ لوگوں کو فقہی مسائل کی تعلیم دیں۔ حضرت عبداللہؓ بن مغفل کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ اُن دس لوگوں میں سے تھے جنہیں حضرت عمرؓ نے بصرہ بھیجا تھا تا کہ وہاں کے لوگوں کو فقہ کی تعلیم دیں۔ پھر جہاں تک وقت ملتا اور فرصت ہوتی خود بھی بالمشافہ لوگوں کو مذہبی احکام کی تعلیم دیتے تھے۔ جمعے کے دن جو خطبہ پڑھتے اس میں ضروری احکام و مسائل بیان کرتے۔ حج کے خطبے میں حج کے مسائل و مناسک بیان فرماتے۔ اس کے علاوہ وقتاً وقتاً افسروں کو مذہبی احکام اور مسائل لکھ کر بھی بھیجا کرتے تھے۔ غرضکہ آپ کی انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ مسلمان رعایا دینِ اسلام کا علم زیادہ سے زیادہ حاصل کرلے۔

یہی صورت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے معاملے میں نظر آتی ہے۔ آپ نے اسلامی سلطنت کے مختلف ممالک میں علماء کو روانہ کیا تا کہ وہاں کے لوگوں کو تعلیم دیں۔ مثلاً

حضرت نافعؒ مولیٰ ابن عمرؓ کو، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، مصر بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دیں۔ جعثل بن عاہان کو مغرب کی طرف روانہ کیا کہ وہاں قرأت کی تعلیم دیں۔ بدوؤں کی تعلیم و تربیت کے لیے یزید بن ابی مالک دمشقی اور حارث بن یمجد الاشعری کو متعین کیا اور اُن کے وظیفے مقرر کیے۔ یزید نے تو وظیفہ قبول کر لیا، مگر حارث نے رضا کارانہ طور پر کام کرنا چاہا اور وظیفہ قبول کرنے سے انکار کیا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اس بات کی خبر ہوئی تو فرمایا: ''یزید نے جو کچھ کیا اس میں ہرج نہیں اور خدا ہم میں حارث جیسے بہت سے اشخاص پیدا کرے۔''

اس کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے لوگوں کو ہدایت دینے کے لیے سلطنت کے مختلف علاقوں میں واعظ اور مفتی مقرر کیے۔ حجاز میں جو واعظ اس خدمت پر مامور تھا اسے حکم تھا کہ ہر تیسرے دن لوگوں کو وعظ و پند کیا کرے۔ فتوے دینے کی خدمت پر جو لوگ مامور تھے وہ اپنے وقت کے انتہائی لائق لوگ تھے۔ مثلاً مصر میں یہ خدمت یزید بن ابی حبیب کے سپرد تھی جن کے متعلق روایت کیا جاتا ہے کہ اہلِ مصر کو حدیث اور فقہ سے سب سے پہلے انہیں نے آشنا کیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عوام کی تعلیم میں کچھ اور چیزیں بھی شامل کیں جن پر ابھی تک کسی نے علمی حیثیت سے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ یہ کہ لوگوں کو غازیوں اور صحابہؓ کے اوصافِ حمیدہ سے واقف کرایا جائے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے عاصم بن عمر بن قتادہ کو حکم دیا کہ دمشق کی مسجد میں مغازی (یعنی غازیوں کے اوصاف) اور مناقب (یعنی صحابہؓ کے اوصاف) پر درس دیا کریں۔ یہ بزرگ مغازی اور سیرت میں کمال رکھتے تھے۔

☆ <u>علمی سوال کرنا:</u> علم کی اشاعت کے سلسلے میں سلف صالحین کے جو حالات ملتے ہیں، اُن میں ایک خاص بات یہ ملتی ہے کہ اُن بزرگوں نے شاگردوں کے لیے علمی سوال کرنے

اور سوال کرنے کے معاملے میں شرم سے پرہیز کرنے پر زور دیا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے۔ ''علم تلاش سے بڑھتا اور سوال سے حاصل ہوتا ہے۔''

ابن شہاب کا مقولہ ہے۔ ''علم خزانہ ہے اور سوال اس کی کنجی ہے۔''

ایک شخص حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے حلقے میں حاضر ہوا۔ محدث طرح طرح کے سوال کر رہے تھے، مگر وہ شرم سے چپ بیٹھا تھا۔ حضرت عبداللہؓ نے محسوس کیا ایک اور پرزے پر کچھ شعر لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ان اشعار کا ترجمہ یہ تھا۔

''بندۂ خدا' آج سوال کرنے سے ہچکچاتے رہے تو کل جب لوٹو گے تو ہاتھ میں ڈھاک کے تین پات ہی ہوں گے۔

شیخ کو سوالوں سے پریشان کرو' تم اسے نرم پاؤ گے اور وہ تمہیں ہاتھوں ہاتھ لے گا۔

بیواؤں کی طرح نہ چلاؤ گے تو شیخ کے پاس سے خالی ہاتھ اُٹھو گے۔''

مراد یہ تھی کہ شرم کے باعث سوال کرنے سے پرہیز نہ کرو بلکہ سوال کرو تا کہ تمہیں علم حاصل ہو۔

امام اصمعیؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ سب علم کیسے حاصل کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ ''مسلسل سوال کرنے سے اور ایک ایک لفظ گرہ میں باندھنے سے۔''

سلیمان بن یسار کا مقولہ ہے۔ ''سلیقے سے سوال کرنا نصف علم ہے اور اعتدال نصف زندگی۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ ''بہت کچھ علم مجھے حاصل ہے مگر جن باتوں کے بارے میں سوال کرنے سے شرمایا تھا۔ ان سے اس بڑھاپے میں بھی جاہل ہوں۔''

ایک مشہور مقولہ ہے۔ ''جو سوال کرنے میں سبکی محسوس کرتا ہے اس کا علم بھی ہلکا

ہوتا ہے۔"

ایسے ہی حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے۔ "جو کوئی طلب علم میں شرماتا ہے اس کا علم حقیر رہتا ہے۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ "پانچ باتیں ایسی ہیں جنہیں خوب یاد رکھنا چاہیے اور ان کے لیے ہر قسم کی مشقت برداشت کرنی چاہیے۔

۱۔ بندہ اپنے گناہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرے۔

۲۔ انسان اپنے پروردگار کے سوا کسی سے آس نہ لگائے۔

۳۔ جاہل سوال کرنے سے نہ شرمائے۔

۴۔ عالم اگر کوئی بات نہیں جانتا' تو نہ جاننے کا اعتراف کرنے میں شرم محسوس نہ کرے۔

۵۔ (مصائب میں صبر کرے کیونکہ) ایمان میں صبر کا درجہ وہی ہے جو جسم میں سر کا۔ جس طرح بے سر کا جسم بے کار ہے' اسی طرح جس انسان میں صبر نہیں اس میں ایمان بھی نہیں۔"

☆**علم چھپانے پر وعید:** جہاں ایک طرف علم کی اشاعت کی فضیلت بیان کی گئی ہے' وہاں دوسری طرف یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی مفید علم کو چھپائے رکھنا سخت عذاب کا موجب ہوگا۔ تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں میں ایسے علماء بھی ہوتے تھے' جن کا اپنا عمل تورات کے احکام کے خلاف ہوتا تھا تو پھر وہ عوام کو وہ احکام بھی نہیں بتانا چاہتے تھے جن کے خلاف وہ عمل کر رہے ہوتے تھے' اس ڈر کے مارے کہ عوام ہم پر اعتراض کریں گے کہ تم خود آسمانی کتاب کے احکام کے خلاف کیوں کر رہے ہو۔ ایسے ہی بعض لوگ اس لیے بھی عوام کو حقائق بتانے سے پرہیز کرتے تھے کہ ایسا کرنے سے ان کے

کسی دنیاوی مفاد کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا تھا اور ایسے لوگ بھی تھے جو خدا کے احکامات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے تا کہ اربابِ اقتدار کی خوشنودی حاصل کریں اور اُن سے صلہ لیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے:

''اگر اہلِ علم اپنے علم کی قدر کرتے اور اس کو اس کے حقداروں کے سامنے پیش کرتے تو اس کے ذریعے سے وہ اپنے زمانے کے لوگوں پر سرداری کرتے' لیکن انہوں نے دنیاداروں سے صلہ حاصل کرنے کے لیے اس علم کو اُن کی مقصد برآریوں کے لیے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نگاہوں میں ذلیل ہو کر رہ گئے۔''

غرضکہ علم دین کو جس مقصد کے لیے بھی چھپایا جائے گا' یہ چھپانا عذاب کا باعث بنے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کہ جس شخص سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی اور اُس نے اسے چھپایا تو خدا قیامت ک روز اُسے آگ کی لگام دے گا۔'' (ابوداؤد)

صحیح بخاری میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے ایک مرتبہ اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اگر تم اس پر تلوار بھی رکھ دو اور میں سمجھوں کہ تمہارے مجھ پر تلوار چلانے سے پہلے پہلے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوا ایک کلمہ بیان کر سکتا ہوں' تو میں اسے بیان کردوں گا۔

بخاری ہی میں ایک روایت بیان ہوئی ہے کہ ایک دفعہ حضرت معاذؓ حضور کی سواری پر حضورؐ کے پیچھے سوار تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اے معاذؓ بن جبل۔ انہوں نے عرض کیا کہ لبیک یا رسولؐ اللہ وسعد یک۔ حضورؐ نے (پھر) فرمایا اے معاذؓ۔ حضرت معاذؓ نے (پھر) عرض کیا کہ لبیک یا رسولؐ اللہ وسعد یک۔ آپؐ نے (پھر) فرمایا۔ اے معاذؓ۔

حضرت معاذؓ نے تیسری دفعہ عرض کیا کہ لبیک یا رسول اللہ وسعد یک۔ (اب کے) آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص بھی سچے دل سے اس بات کی گواہی دے گا کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے (دوزخ کی) آگ حرام کردے گا۔ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ کیا میں یہ بات لوگوں کو بتا نہ دوں تاکہ وہ خوش ہو جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ پھر وہ (اسی پر) بھروسہ کرلیں گے (اور عمل نہیں کریں گے۔ چنانچہ حضرت معاذؓ نے یہ بات کسی کو نہ بتائی مگر) جب اُن کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے یہ بات اس ڈر کے مارے بتادی کہ کہیں انہیں اس بات کا گناہ نہ ہو (کہ ان کے پاس حضورؐ کی بتائی ہوئی ایک بات تھی اور وہ اسے لوگوں کو بتائے بغیر دنیا سے چلے گئے۔) (بخاری)

کلام پاک میں ایک آیت ہے:

"جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں۔ درآنحالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یقین جانو کہ اللہ بھی اُن پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کردوں گا اور میں بڑا درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔" (البقرہ، آیات ۱۵۹، ۱۶۰)

بخاری میں ایک روایت آتی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ نے بہت احادیث بیان کیں (بات یہ ہے کہ) اگر قرآن میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ پھر انہوں نے مندرجہ بالا دونوں آیتیں تلاوت کیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کا مطلب یہ تھا کہ میں اس ڈر کے مارے ہر حدیث بیان کردیتا

ہوں کہ میں دینی احکام کو چھپانے کے گناہ کا مرتکب نہ ٹھہرایا جاؤں۔

☆**علم کی راہ میں مال خرچ کرنا:** علم کی اشاعت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کی راہ میں مال خرچ کیا جائے۔ چنانچہ علم کی اہمیت کو سمجھنے والے لوگوں نے اس راہ میں بھی بہت تگ ودو کی ہے۔ علم حاصل کرنے اور علم پھیلانے دونوں راہوں میں دل کھول کر روپیہ خرچ کیا جاتا تھا اور اسے روپے کا بہترین مصرف سمجھا جاتا تھا۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے والد حضرت مبارکؒ نے انہیں تجارت کرنے کے لیے پچاس ہزار درہم دیے۔ حضرت ابن مبارکؒ اس رقم کو لے کر سفر پر چل پڑے۔ دُور دُور کے ملکوں کے سفر کیے۔ بڑے بڑے علماء کی خدمت میں پہنچے' ان سے فیض حاصل کیا اور حدیث رسولؐ کے دفتر لے کر گھر واپس آ گئے۔ جب والد نے پوچھا کہ بیٹا کیا کما کر لائے تو کہنے لگے کہ بہت کچھ کما کر لایا ہوں۔ لوگ تو ایسی تجارت میں رقم لگاتے ہیں جس کا نفع صرف دنیا ہی میں ملتا ہے' مگر میں نے اپنی رقم ایسی تجارت میں لگائی ہے جس کا نفع دونوں جہاں میں ملے گا۔ جب حضرت مبارکؒ کو پتہ چلا کہ اُن کا لائق فرزند کس تجارت پر روپیہ لگا کر آیا ہے تو وہ خوشی سے نہال نہال ہو گئے اور بیٹے کو تیس ہزار کی رقم اور دے کر کہا۔ بیٹے' یہ لو' اور اگر تمہاری کامیاب تجارت میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کو پورا کر لو۔

علی بن عاصم بیان کرتے ہیں کہ ابتدائے طالب علمی میں میرے والد نے مجھے ایک لاکھ درہم دیے اور فرمایا کہ بیٹا' یہ لاکھ درہم لو اور علم کی طلب کی راہ میں صرف کرو' مگر یاد رکھنا کہ ایک لاکھ درہم کا معاوضہ ایک لاکھ حدیثوں سے ہوگا۔

مراد یہ تھی کہ ایک لاکھ احادیث لے کر آنا۔

ایسے ہی بیان کیا جاتا ہے کہ ہشام بن عبداللہؒ نے علم کی طلب کی راہ میں سات لاکھ درہم صرف کیے۔ متوکل نجاریؒ نے اسّی ہزار درہم' حافظ کبیر بن سنجر نے نو ہزار اشرفیاں

حافظ ابن رستم نے تین لاکھ درہم اور امام ذہبیؒ نے تین لاکھ درہم ابوبکر جورقی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے طلبِ علم پر ایک لاکھ درہم صرف کیے اور جس علم کو اتنا گراں خریدا تھا اسے کبھی سستا نہ بیچا یعنی کبھی اس کے ذریعے دنیا نہ خریدی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کے بارے میں بتلایا جاتا ہے کہ جب انہوں نے صحیح بخاری کی تشریح ''فتح الباری'' مکمل کر لی تو اس خوشی میں ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا جس پر پانچ سو اشرفی خرچ ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے جہاں علم حاصل کرنے پر بہت روپیہ صرف کیا تھا وہاں علم کی اشاعت پر بھی بے دریغ دولت خرچ کی۔ آپ لوگوں کو دین کا علم حاصل کرتے دیکھتے تو بے انتہا خوش ہوتے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے طالب علموں کو معلوم کرتے جو علم کا شوق رکھتے تھے' مگر غریب تھے۔ اگر روزی کمانے میں لگ جاتے تو علم حاصل نہ کر سکتے اور جب علم حاصل کرنے میں مصروف ہوتے تو روزی کی تنگی کا سامنا ہوتا۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی جو اشاعتِ علم میں لگے ہوتے اور روزی نہ کما سکتے' ان سب کی حضرت ابن مبارکؒ مالی امداد کرتے رہتے تاکہ وہ روزی کی فکر سے آزاد ہو کر علم کی خدمت میں یکسو ہو کر لگے رہیں۔ آپ فرماتے کہ میں ان لوگوں کی مدد اس لیے کرتا ہوں کہ ان کے ذریعے دین کا علم پھیلتا ہے اور نبوت ختم ہو جانے کے بعد نیکی کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ دین کا علم پھیلایا جائے۔ فرمایا کرتے تھے کہ روپیہ خرچ کرنے کا اس سے زیادہ اچھا موقع اور کوئی نہیں ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حالات میں بھی یہی ملتا ہے کہ علمِ دین سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بہت مالی امداد فرمایا کرتے تھے تاکہ وہ روزی کی فکر سے آزاد ہو کر علم دین کی کما حقہٗ خدمت کر سکیں۔ شہر حمص میں جو علماء تھے ان کے بارے میں وہاں کے گورنر کو لکھا:

''جن لوگوں نے دنیا چھوڑ کر اپنے آپ کو فقہ کی تعلیم کے لیے وقف کر رکھا ہے' اُن میں سے ہر ایک کو جب میرا خط پہنچے بیت المال سے سو دینار دو تاکہ وہ لوگ (اشاعتِ علم کی) اس حالت کو قائم رکھ سکیں۔''

یہی حال آپ کا طلبہ کے معاملے میں تھا۔ آپ فیاضی سے ان کے وظائف مقرر کرتے تھے تاکہ وہ اطمینانِ قلب سے حصولِ علم میں لگے رہیں۔

ایک دن ملک شاہ سلجوقی کو معلوم ہوا کہ اُن کے علم دوست وزیر نظام الملک طوسی نے تعلیم پر بہت زیادہ روپیہ خرچ کر دیا ہے۔ ملک شاہ کو تشویش ہوئی اور کہا کہ اس زرِ کثیر سے تو ایک جرار لشکر تیار ہو سکتا ہے۔ اس پر نظام الملک طوسی نے جواب دیا۔ ''اے بادشاہ! تیری فوج کے تیر تو صرف چند قدم ہی پر کام دے سکتے ہیں مگر میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کے تیر زمین کے سارے طول و عرض میں مؤثر ہیں اور اس کی دعاؤں اور حسنات کے تیر تو آسمان کی سپر سے بھی نہیں رُک سکتے۔''

حقیقت یہ ہے کہ علم کی اشاعت کرنا مخلوق پر انتہائی شفقت کرنا ہے کہ وہ اس کی روشنی میں اپنی دنیوی زندگی بھی سنوار لیں اور اخروی بھی۔ علم حاصل کر کے آگے اسے دوسروں تک پہنچانا ایسے ہی ہے جیسے ایک دیے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا جلتا چلا جائے اور اس مسلسل روشنی میں لوگ اپنی منزل کا نشان سہولت سے پاتے چلے جائیں۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ:

''علم والے بارانِ رحمت ہیں، جہاں بھی ہوں گے نفع پہنچائیں گے۔''

حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک دفعہ حضرت ابوالدرداءؓ کو لکھا کہ:

''علم ایک چشمہ ہے جس پر لوگ آتے ہیں اور اس سے اپنے لیے نالیاں نکالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہوتی ہے تو بہت سے لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر کوئی حکمت خاموش ہو تو سمجھ لو کہ وہ ایسا جسم ہے جس میں روح نہیں۔ اگر کوئی علم ایسا ہے جس کا اظہار نہیں ہوتا تو وہ ایسا خزانہ ہے جو زمین میں دفن کیا ہوا ہے اور کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ عالم دین کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اندھیرے راستے میں لوگوں کو چراغ دکھاتا ہو کہ لوگ اس کی روشنی میں چلیں اور اس کو دل سے دعائیں دیں۔

اپنا حال!

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اردو کلام میں دو بڑی مشہور نظمیں ہیں۔ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' شکوہ میں حضرت علامہؒ نے ایک ایک کر کے اُن کارناموں کو گنایا ہے جو امتِ مسلمہ نے خدمتِ اسلام کے سلسلے میں سرانجام دیے تھے اور اللہ کے حضور میں شکایت کی ہے کہ تیرے دین کی اتنی خدمات سرانجام دے چکنے کے باوجود ہم تیری رحمت اور فضل و کرم سے دُور کیوں ہیں' کیوں ہم پر مصائب نازل ہوتے رہتے ہیں اور کیوں ہم آئے دن کسی نہ کسی عذاب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ علامہؒ فرماتے ہیں۔

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے		نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے		تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

اور شکایت کرتے ہیں کہ اس کے باوجود ہمیں بے وفا گنا جاتا ہے اور بڑے دُکھ سے فریاد کرتے ہیں کہ:

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

پھر ''جواب شکوہ'' میں علامہؒ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شکوے کا جواب دیتے ہوئے مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ تم پر عذاب اس لیے نازل ہو رہے ہیں کہ تم اپنے آباؤ

اجداد کا طریقہ چھوڑ کر تن آسانی اور بے راہروی کا شکار ہو گئے ہو اور تم میں وہ جذبہ اور وہ عمل ہی نہیں رہا جس نے تمہارے آباؤ اجداد کو رحمتوں کا مستحق بنایا تھا۔

ارشاد ہوتا ہے:

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

ان اشعار کو یہاں بیان کرنے سے مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں کا فخریہ بیان اُس وقت تک بالکل بے معنی ہے جب تک ہم خود اپنے اندر اُن جیسی طلب علم اور جذبہ اشاعت علم پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جن عالی حوصلہ لوگوں نے علم کی تلاش میں بحر و بر ایک کر دیا تھا اور علم کی اشاعت کی دُھن میں دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا تھا۔

تھے تو آباء وہ ہمارے مگر ہم کیا ہیں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں

تو کیا جو کچھ وہ عالی حوصلہ اور دانا لوگ کر گئے تھے' اس سے ہمارا فریضہ بھی ادا ہو گیا ہے اور اب اس بات کی کوئی ضرورت نہیں رہی کہ ہم حصولِ علم اور اشاعتِ علم کے لیے جدوجہد کریں؟

ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں۔ جو شے اُن کے لیے ضروری تھی' وہ ہمارے لیے بھی ضروری ہے اور بلاشبہ ہمیں حق ہے کہ ہم اُن کے کارنامے پڑھ کر خوش ہوں اور انہیں اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھیں' مگر یہ حق ہمیں صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب

ہم بھی ان روشن راہوں پر چلنے کی کوشش کریں جن پر وہ چلتے تھے'
اور علم کی راہ میں جو تکالیف بھی آئیں اُن کا مقابلہ کریں' جیسے انہوں نے کیا تھا'
اور علم کی اشاعت کر کے صدقہ جاریہ اور نام نیک چھوڑ جائیں' جیسے انہوں نے
چھوڑا تھا۔لہٰذا ہمیں لازماً اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ ہم

۱۔ حصولِ علم کے لیے کن کن ذرائع سے کام لیں اور
۲۔ اشاعتِ علم کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کریں۔



حصولِ علم کے ذرائع: (۱)

درس گاہیں

کتاب کے شروع میں اس بات کو واضح کیا جاچکا ہے کہ ''علم'' ان معلومات کا نام ہے جو انسان کو اس قابل بناتی ہیں کہ خدا کا نائب ہونے کی حیثیت سے جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں انہیں بہتر سے بہتر طریقے سے سرانجام دے کر اپنے معبودِ حقیقی کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کرلے۔ علم کی اس تعریف کو ذہن میں رکھ کر اگر ہم اپنی درس گاہوں پر نگاہ ڈالیں تو یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے کہ ان میں علم کے طالبوں کی تعداد افسوسناک حد تک کم ہے۔

یہ درس گاہیں دینی مدارس ہوں یا عام اسکول' کالج اور یونیورسٹیاں وغیرہ اصطلاح کی حد تک یہاں پڑھنے والوں کے لیے ''طلبہ'' اور ''طالبات'' ہی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں یعنی علم کے طالب۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس بھیڑ میں حقیقی طالبانِ علم بہت ہی کم ہوتے ہیں' اکثریت انہیں کی ہوتی ہے جو علم کی خاطر نہیں بلکہ بعض دوسرے مقاصد کی خاطر درس گاہوں میں داخلہ لیتے ہیں۔

بسا اوقات پڑھنے سے علم کا حصول نہیں بلکہ ڈگریوں کا حصول مقصود ہوتا ہے جو روزی کمانے کا ذریعہ بھی بنتی ہیں اور معاشرے میں اہمیت دلانے کا بھی۔ پھر اُن ''طالبانِ علم'' کی بھی کمی نہیں جو درسگاہوں میں صرف اس لیے آتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنا فیشن میں داخل ہے اور تعلیمی اسناد کے بغیر لوگ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ پھر بعض طلبہ اور

طالبات ایسے بھی ہیں جنہیں درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے مضامین میں دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ وہاں کی دوسری سرگرمیاں پرکشش لگتی ہیں۔ مثلاً کھیلیں' مباحثے اور ایسی ہی اور سرگرمیاں جو انہیں مواقع بہم پہنچاتی ہیں کہ مقابلوں میں حصہ لے کر اپنی اہمیت منوا سکیں۔ پھر ہر شخص کو اپنے ہم جنسوں اور ہم عمروں کی صحبت بھی پسند ہوتی ہے۔ درس گاہوں میں دوستوں اور سہیلیوں کی بہتات اور وہاں کی فضا کے قہقہے چہچہے اور شوخیاں شرارتیں بھی کچھ کم کشش کا باعث نہیں ہوتیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ دلوں میں امتحانات کا کانٹا کھٹکتا رہتا ہے۔ اکثر طلبہ اور طالبات ضرورت سے زیادہ ہنسنے اور مجرمانہ حد تک وقت ضائع کرنے کا بندوبست کر ہی لیتے ہیں۔ پھر درسگاہیں نئے سے نئے فیشن سے واقفیت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہیں اور یہ چیز اُن درسگاہوں مین بھی موجود ہے جہاں یونیفارم کی سختی سے پابندی کرائی جاتی ہے۔ غرضکہ درسگاہوں میں علم کے سچے شائقین کا تناسب بہت کم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا معیار بھی دن بدن گرتا چلا جا رہا ہے۔

ان سطور میں جو کچھ بیان کرنا مقصود ہے' وہ یہ ہے کہ جن طلبہ اور طالبات کو درسگاہوں کی امداد حاصل ہے انہیں پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اس قیمتی موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ کیونکہ اگرچہ علم کا سچا جذبہ رکھنے والے درس گاہوں کے بغیر بھی کوشش و محنت سے علم حاصل کر ہی لیتے ہیں' تاہم یہ تو حقیقت ہے کہ درسگاہوں میں داخل ہو کر' استاد کی امداد حاصل کر کے علم کی راہ کی مشکلات بہت آسان ہو جاتی ہیں' جو طالب علم درسگاہوں سے واقعی علم لے کر نکلنے کے خواہشمند ہیں انہیں ذیل کے چند امور کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

☆ **زمانہ طالب علمی کی قدر:** سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ اگرچہ ایک مسلمان کی پوری زندگی طلبِ علم میں گزرنی چاہیے' تاہم عمر کا وہ حصہ جو خاص طور پر علم حاصل کرنے کے

لیے مخصوص کیا گیا ہوتا ہے' بہر حال بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کے ایک ایک منٹ کی قدر کرنی چاہیے۔ جب عمر گزر جاتی ہے اور زندگی کے بہت سے فرائض کندھوں پر آپڑتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کے لیے وقت نکالنا کتنا مشکل کام ہے۔ لہٰذا اب جب آپ کے کندھوں پر فرائض کے بوجھ کم ہیں اور آپ کی امداد کے لیے درس گاہیں اور اُستاد بھی موجود ہیں اور وہ مشفق ہستیاں بھی موجود ہیں جو آپ کی تعلیم کے اخراجات اپنے ذمے لیے ہوئے ہیں' آپ کا حصولِ علم سے لاپروائی برتنا اور زندگی کے انتہائی قیمتی لمحات کو ضائع کرنا ایک مجرمانہ فعل ہے۔

بہت سے طلبہ اور طالبات زندگی کے انمول لمحات کو ضائع کرنے میں حد درجہ جری اور بیباک ہوتے ہیں اور اس زیاں کاری کے ساتھ کسی قسم کا احساسِ زیاں بھی نہیں رکھتے۔ جو طلبہ اور طالبات درسگاہوں میں آ کر کلاسوں میں حاضر ہونے کے بجائے کھیل کے میدان میں گھومتے پھرتے اور خوش گپیوں میں مشغول رہتے ہیں اور جو کمرۂ جماعت میں اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دینے کی بجائے ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرنے' طرح طرح کی شرارتیں کرنے اور استاد کو تنگ کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور جو بیماری کے جھوٹے سرٹیفکیٹ مہیا کر کر کے امتحانات سے جان چھڑانے کی فکر میں رہتے ہیں اور اگر امتحان دینا پڑ ہی جائے تو نقلیں مارنے کے نئے سے نئے طریقے ایجاد کرنے کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ ان طالب علموں کے بارے میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انہیں علم کا شوق درسگاہوں میں لایا ہے۔ انہیں درسگاہوں میں لانے کا سبب جو بھی ہو طلبِ علم تو ہرگز نہیں ہوتی' کیونکہ یہی تو شے ہے جس سے بچنے کی وہ زمانہِ طالب علمی میں سر توڑ کوشش کرتے رہتے ہیں۔

لہٰذا ہم دیکھ سکتے ہیں کہ درسگاہوں میں ایسے طالبانِ علم بھی ہوتے ہیں جو

درسگاہوں کی زندگی ختم کر کے اور اسناد لے چکنے کے بعد بھی جاہل کے جاہل ہی رہتے ہیں۔

موجودہ نظام تعلیم میں درسگاہوں میں ایک خاص شے ہوتی۔ ہے جسے ''حاضری کارجسٹر'' کہا جاتا ہے۔ ہر کلاس شروع ہوتے وقت اس رجسٹر پر حاضری لگائی جاتی ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ کون کون طالب علم کلاس میں موجود ہے اور کون کون غیر حاضر ہے۔ اس رجسٹر کی موجودگی ہی طالب علموں کی بدشوقی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔۔۔ اگر طالب علم کہلائے جانے والے واقعی علم کے طالب ہوں تو اس رجسٹر کی ضرورت کیوں پیش آئے۔ علم کے طالبوں کو تو خود اس بات کی بے چینی ہونی چاہیے کہ وہ کلاسوں میں دی جانے والی تعلیم کے کسی حصے سے محروم نہ رہ جائیں۔ انہیں غیر حاضری کا اور جرمانوں کا ڈراوا دے کر کلاسوں میں لانے کی ضرورت کیوں پیش آئے۔ اگر سال بھر کا وہ وقت اکٹھا کیا جائے جو بار بار حاضری لینے پر صرف ہوتا رہتا ہے تو وہ اتنا زیادہ ہوگا کہ اگر اسے تعلیم پر صرف کیا جاتا تو طالب علم بہت کچھ مزید حاصل کر لیتے۔ مگر یہ تضیع اوقات اس لیے گوارا کی جاتی ہے بلکہ اسے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ علم کی طلب کا دعویٰ کرنے والے سبھی صحیح معنوں میں طالبانِ علم نہیں ہوتے اور درسگاہوں میں داخل ہونے سے ان کا مقصد حصولِ علم نہیں ہوتا بلکہ درسگاہوں کی زندگی سے حظ اٹھانا اور مادی فوائد حاصل کرنا ہوتا ہے۔

نوعمری میں کھانے' کھیلنے' شوخی شرارت کرنے اور سجنے بننے کا شوق ایک طبعی امر ہے۔ ایسے ہی درس گاہوں میں کھیلوں' مباحثوں اور ایسی ہی دوسری سرگرمیوں کو اسی لیے تو رکھا جاتا ہے کہ طالب علم اُن میں حصہ لیں اور اُن کا اعتدال کے ساتھ ان سرگرمیوں میں حصہ لینا ان کی تعلیم پر کوئی برا اثر بھی نہیں ڈالتا' مگر دِقّت یہ ہے کہ بعض طلبہ اور طالبات ان سرگرمیوں کے معاملے میں حد درجہ بے اعتدالی اختیار کر لیتے ہیں' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ

اصل مقصد جس کے لیے درس گاہیں قائم کی جاتی ہیں' بالکل پیچھے چلا جاتا ہے اور ثانوی حیثیت رکھنے والی سرگرمیاں بلکہ بعض اوقات مضرِ مصروفیات اور بیہودہ شوخیاں اور شرارتیں اُن کے دل و دماغ پر اس طرح حاوی ہو جاتی ہیں کہ انہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کو قتل کیے جا رہے ہیں۔

گپیں مارنے اور شوخیوں شرارتوں میں وقت ضائع کرتے والے طالب علموں کی غلط روی تو ظاہر ہی ہے۔ مگر جو طالب علم نسبتاً کم اہمیت رکھنے والی سرگرمیوں ہی کو مقصد بنا لیتے ہیں وہ بھی کوئی عقلمندی کا کام نہیں کرتے۔ اگر ایک ماہر کھلاڑی یا ایک سحر بیان مقرر سال گزرنے کے بعد بری طرح فیل ہو جائے اور جو سند اس نے چار سال میں لینی تھی' اس پر چھ سال لگا دے اور انجام کار پاس ہو بھی تو اتنے معمولی نمبر لے کر پاس ہو اگر آگے کسی اور درسگاہ میں داخلہ لینا تھا' تو وہاں داخل نہ ہو سکے اور اگر ملازمت کرنا پیش نظر تھا تو وہاں بھی یہ چیز راہ کی رکاوٹ بن جائے' تو یہ صورتِ حالات اس طالب علم کی کامیابی کی نہیں بلکہ ناکامی کی دلیل ہے۔

لہٰذا وہ لڑکے اور لڑکیاں جو زمانہ طالب علمی گزار رہے ہیں' انہیں اس بات پر خصوصی توجہ دینی چاہیے کہ جو مواقع انہیں اس وقت حاصل ہیں اُن سے وہ پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور زندگی کے قیمتی لمحات کو ضائع کرنے سے بچیں۔ انہیں یہ مشورہ تو نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کتاب کے کیڑے بن کر رہ جائیں' بیشک اعتدال کے ساتھ دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیں اور دل کو خوش کرنے والے جائز کاموں کی طرف بھی مناسب توجہ دیں' مگر انہیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ حصول علم کے لیے جو فارغ البالی اُنہیں اس وقت حاصل ہے اس کا زندگی میں دوبارہ حاصل ہونا بہت مشکل ہے' اس لیے انہیں زمانۂ طالب علمی کے ایک ایک منٹ کو قیمتی سمجھنا چاہیے۔ انسان کی زندگی کی کامیابی بہت حد

تک اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ اُسے جائز اور ناجائز' مفید اور مضر اور زیادہ اہم اور کم اہم کی پہچان حاصل ہو۔ زمانہ طالب علمی ہی میں یہ پہچان پیدا کر لینا انشاء اللہ پوری زندگی کی کامیابی کی چابی ثابت ہوگا۔

☆ اُستاد کا احترام: ایک اور خاص بات جس کی طرف موجودہ طالب علموں کی توجہ دلانا ضروری ہے' استاد کا احترام ہے۔ افسوس ہے کہ جیسے جیسے تعلیم عام ہو رہی ہے طالب علموں کے دلوں میں استادوں کے لیے وہ ادب و احترام نہیں رہا جو زمانہ ماضی میں اُن کی ایک خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ یہ قدرتی نتیجہ ہے علمی بدذوقی کا۔ جب دل میں کسی شے کے قیمتی ہونے کا پورا احساس نہیں ہوتا تو پھر جس ہستی نے وہ شے دی ہوتی ہے' وہ بھی چنداں اہم معلوم نہیں ہوتی۔ جن طالب علموں نے کلاسوں سے جان چرائی ہوتی ہے' ان کے دلوں میں استاد کے لیے محبت اور احترام کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ استاد کے احسان کو تو وہی طالب علم صحیح طور پر مان سکتا ہے جس کے دل میں علم کی طلب ہو اور اسی سے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ استاد کو محبت اور احترام دے گا۔

علامہ اقبالؒ کے استاد سید میر حسن بڑے عالم فاضل شخص تھے اور علامہ اپنے استاد کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ جب علامہ کو "سر" کا خطاب دیا جانے لگا تو اس وقت کے گورنر پنجاب نے انہیں بلا کر پوچھا کہ کیا آپ یہ خطاب لینا منظور کرتے ہیں۔ علامہ نے خطاب لینا اس شرط پر منظور کیا کہ ساتھ ہی ان کے استاد سید میر حسن کو بھی "شمس العلماء" کا خطاب دیا جائے۔ گورنر نے پوچھا کہ کیا انہوں نے کوئی کتاب تصنیف کی ہے؟ علامہ نے فرمایا کہ انہوں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی مگر ان کی زندہ تصنیف میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔ چنانچہ علامہ کی شرط منظور کر لی گئی۔ سید میر حسن سیالکوٹ رہتے تھے اور خطاب لینے کے لیے ضروری تھا کہ وہ لاہور آتے۔ علامہؒ کو یہ بھی اچھا نہ لگا کہ اُن کے استاد کو خطاب

لینے کے لیے سفر کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے۔ چنانچہ پہلی شرط منظور کروا کر وہاں سے رخصت ہوئے تو چند قدم جا کر پھر لوٹ آئے اور فرمایا کہ ایک اور شرط تو میں بھول ہی گیا۔ وہ یہ کہ میرے بوڑھے استاد کو خطاب لینے کے لیے سیالکوٹ سے لاہور آنے کی دعوت نہ دی جائے' اس پر علامہؒ کی یہ شرط بھی منظور کر لی گئی۔

سید میر حسن کے لیے علامہؒ کے دل میں اتنی محبت اور احترام تھا کہ جب ان کا ذکر کرتے' آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ رعب اور ادب کے باعث کبھی انہیں اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ زندگی میں صرف ایک دفعہ سید میر حسن صاحب کے سامنے میرے منہ سے ایک مصرع نکلا' وہ بھی اتفاق سے۔ ہوا یوں کہ سید صاحب کسی کام کے لیے گھر سے نکلے۔ ایک بچہ جوان کے عزیزوں میں سے تھا' ان کے ساتھ تھا۔ اس کا نام ''احسان'' تھا۔ سید صاحب کہنے لگے کہ اقبالؔ اسے گود میں اٹھا لو۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ بچہ تھا خوب موٹا تازہ۔ کچھ دور جا کر میں تھک گیا۔ چنانچہ میں نے بچے کو تو ایک دکان کے تختوں پر کھڑا کر دیا اور خود ذرا ستانے لگا۔ سید صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ ہمیں ساتھ نہ پا کر الٹے پاؤں لوٹے اور قریب آ کر فرمایا۔ اقبال

اس کی برداشت بھی دشواری ہے۔''

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا:

''تیرا احسان بڑا بھاری ہے!''

ایک مقولہ ہے کہ ''جس نے معالج کی عزت نہ کی اس کو شفا حاصل نہ ہو گی اور جس نے استاد کی عزت نہ کی اس کو علم حاصل نہیں ہو گا۔''

استاد کے آگے گستاخیاں کرنا درحقیقت کم ظرفی کی دلیل ہے اور یہ کم ظرفی اس وقت اور بھی زیادہ شدت سے نمایاں ہو جاتی ہے جب بعض طالب علم استاد کے آگے اس

لیے گستاخی کرتے ہیں کہ انہیں اپنے والدین یا اہلِ خاندان کے جاہ واقتدار کا غرہ ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایک واقعہ آتا ہے جو اپنے اندر ایسے طالب علموں کے لیے بہت کچھ سبق رکھتا ہے:

"بنو عباس کے خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے امین کو مشہور عالم اصمعی کے پاس علم وادب سیکھنے کے لیے بھیجا۔ ایک دن خلیفہ بغیر اطلاع دیے وہاں پہنچ گئے اور دیکھا کہ اصمعی وضو کرتے ہوئے پاؤں دھو رہے ہیں اور شہزادہ پانی ڈال رہا ہے۔ اس پر خلیفہ بہت غصے میں آئے اور اصمعی سے کہا کہ میں نے اسے آپ کے پاس علم وادب سیکھنے کے لیے بھیجا تھا تو آپ نے اسے یہ حکم کیوں نہ دیا کہ ایک ہاتھ سے پانی ڈالے اور دوسرے ہاتھ سے آپ کا پاؤں دھوئے ۔۔۔ بعد میں ہارون الرشید نے اپنے دوسرے بیٹے مامون کو بھی اصمعی کے پاس بھیج دیا۔ ان دونوں شہزادوں کا یہ حال تھا کہ جب اصمعی مسجد سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو دونوں ان کی جوتیاں اٹھانے کے لیے دوڑتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔"

ظاہر ہے کہ گستاخ طالب علموں کے اہلِ خاندان کو وہ جاہ واقتدار حاصل نہیں جو ہارون الرشید کو حاصل تھا۔ مگر اس کے دل میں علم کی قدردانی تھی جو بدشوق طالب علموں کے دل میں نہیں ہوتی۔

بلاشبہ سبھی طالب علم ایسے نہیں ہوتے، خصوصاً طالبات میں ایسی گستاخیاں کرنے والیوں کی تعداد بہ نسبت طلبہ کے بہت کم ہے۔ تاہم یہ لوگ جتنے بھی ہیں علم اور علمی درسگاہوں کے لیے بدنامی کا داغ ہیں۔ علم کے ہر طالب علم کو اس کم ظرفی سے بچنا چاہیے کہ جن ہستیوں سے انہوں نے علم جیسی ارفع چیز حاصل کرنی ہو، ان کے ادب اور عزت میں کوتاہی کر کے اپنے گھٹیا پن کا ثبوت دیں۔

☆**اسلامیات:** علم کی جو تعریف بیان کی جا چکی ہے وہ درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے مضامین میں سے اس مضمون کو زیادہ اہمیت کا حامل بناتی ہے جسے عام طور پر ''اسلامیات'' کہا جاتا ہے اور جو قرآن' حدیث' فقہ' تاریخ اسلام' عربی گرائمر' اسلامی نظامِ حیات وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ شکر کا مقام ہے کہ درسگاہوں میں اب تقریباً ہر جگہ اسلامیات پڑھانے کا انتظام موجود ہے اور یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ عموماً اسلامیات کی کلاسوں میں طالب علموں خصوصاً طالبات کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان میں بہت کم ایسی ہوتی ہیں جو اس مضمون کی اہمیت کو سمجھ کر شوق سے اس طرف آئی ہوں' اکثریت انہیں طالبات کی ہوتی ہے جنہیں دینی علوم کی کوشش نہیں بلکہ بعض دوسرے مقاصد اس طرف لاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ اس لیے اسلامیات لیتا ہے کہ ان کے خیال کے مطابق یہ مضمون بہ نسبت بعض دوسرے مضامین کے آسان ہوتا ہے۔ کچھ اور طالبات اس لیے اسے لیتی ہیں کہ اس میں انہیں زیادہ نمبر حاصل کرنے کی امید ہوتی ہے۔ بعض طالبات ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اسلامیات پڑھیں۔ البتہ تھوڑی سی تعداد اُن طالبات کی بھی ہوتی ہے جو دینی جذبہ رکھنے اور قرآن و سنت سے محبت ہونے کے باعث یہ مضمون منتخب کرتی ہیں۔

علومِ اسلامیہ کے طالب علموں کو یاد رکھنا چاہیے کہ علم قرآن' علم حدیث اور قرآن وحدیث سے تعلق رکھنے والے دوسرے دینی علوم کو حاصل کرتے ہوئے مقصد یہ رکھنا کہ محنت زیادہ نہ کرنی پڑے اور نمبر زیادہ مل جائیں' ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص کو کروڑ روپے کے نوٹ دیے جائیں اور وہ انہیں فائدہ پہنچانے والے مصارف پر صرف کرنے کے بجائے انہیں جلا کر اپنا کھانا پکانا شروع کر دے۔ جس طرح ایسا شخص اپنی حاصل کردہ دولت کو انتہائی احمقانہ مصرف پر صرف کرتا ہے ایسا ہی حال اس شخص کا ہے جو خدا کے کلام اور نبی کی

احادیث اور احکام دین کا مطالعہ کرے، صرف اس لیے کہ اسے بورڈ یا یونیورسٹی میں نمبر زیادہ مل جائیں۔ چونکہ ارفع علوم کو سیکھنے کا مقصد اتنا گھٹیا رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے انہیں اس طرح سیکھا ہی نہیں جاتا جس طرح انہیں سیکھے جانے کا حق ہے۔

اس وقت صورتِ حالات یہ ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ہو جہاں والدین بچوں کو دینی تعلیم و تربیت دینے کا بندوبست کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ کسی نے بڑا تیر مارا تو ناظرہ قرآن پڑھوا دیا۔ اب یہ کہ قرآن کا پیغام کیا ہے اور قرآن کو لانے والے نے کس طرح اپنی زندگی میں اس کی عملی تشریح کر کے دکھائی تھی، اس کا تو اکثر والدین کو خود بھی علم نہیں ہوتا، انہوں نے بچوں کو کیا بتانا ہے۔ جن گھرانوں کو ''دیندار'' کہا جاتا ہے، وہاں بھی عموماً اتنی ہی دینداری ہوتی ہے کہ نسلاً بعد نسلٍ کچھ روایات چلی آ رہی ہوتی ہیں جن پر تھوڑا بہت زور دے دیا جاتا ہے۔ باقی دین کو شعوری طور پر اختیار کرنا، قرآن و حدیث کو غور و فکر سے پڑھنا، دینی احکام کے اغراض و مقاصد کو سمجھنا، یہ سب ضروری چیزیں ان ''دیندار'' گھرانوں میں بھی کم ہی ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ روایتی دینداری عموماً بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور ایسے گھرانوں کی نئی نسلیں اسی طرح دین سے دُور ہو جاتی ہیں جس طرح اُن گھرانوں کی ہوتی ہیں جو دیندار نہیں کہلاتے۔ بلاشبہ ایسے گھرانے بھی موجود ہیں جو اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کے معاملے میں اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں مگر ان کی تعداد اتنی تھوڑی ہے کہ اکثریت کے مقابلے میں وہ گویا نہ ہونے کے برابر ہیں۔

جب گھروں میں حالات یہ ہوں تو پھر تو اس بات کو خدا کا ایک خاص فضل سمجھنا چاہیے کہ درس گاہوں میں اسلامی علوم پڑھانے کا بندوبست موجود ہے۔ ایک طالب علم بچی جو اسلامیات پڑھتی تھی، ایک دفعہ اپنی استاد سے کہنے لگی کہ ''مجھے تو دین سے واقفیت ہی کالج آنے کے بعد ہوئی ہے، گھر میں تو کبھی کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔''

یہ صرف اسی ایک بچی کا معاملہ نہیں ہے' بے شمار بچیاں جب کالج میں داخل ہوتی ہیں تو اگر وہ اسلامیات کا مضمون لیتی ہیں تو اس میں پڑھی جانے والی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی انہیں نئی لگتی ہیں۔ لہٰذا جو طالب علم اسلامیات کا مضمون لیتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ دل سے اس سنہری موقع کی قدر کریں اور اسے پڑھتے ہوئے اپنا مقصد یہ قرار دیں کہ دینی علوم میں نگاہ حاصل کرنی ہے نہ کہ آسانی اور نمبروں کو اپنا مقصود بنائے رکھیں۔ دینی علوم حاصل کرتے ہوئے صرف نمبروں کو پیش نظر رکھنا انتہائی ارفع عمل سے انتہائی گھٹیا مقصد حاصل کرنا ہے۔ اب یہ کہنا کہ نمبر حاصل کرنا بھی تو ایک ضرورت ہے' کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اس طرح تو جو شخص کروڑ روپے کے نوٹ جلا کر کھانا پکائے گا' وہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کھانا پکانا بھی تو ایک ضرورت ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ اگر وہ اپنی اس رقم کو صحیح مصارف پر صرف کرتا تو ایندھن تو اسے ڈھیروں ڈھیر مل جاتا۔ ایسے ہی جو طالب علم اسلامیات کو پڑھتے ہوئے مقصد یہ رکھیں کہ انہوں نے دین کا صحیح علم حاصل کرنا ہے تو وہ اپنے نصاب کو اتنے اچھے طریقے سے پڑھیں گے کہ نمبر تو انہیں خود بخود ہی زیادہ مل جائیں گے۔ قرآن وحدیث پڑھتے ہوئے انہیں نمبروں کو مقصود بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔

کالجوں کی سطح پر جو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے' اس کے نصاب پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی طالب علم اس سارے نصاب کو شوق اور جذبے سے پڑھ لے تو وہ دین کا خاصا علم حاصل کر لیتا ہے اور ساتھ ہی اس قابل بھی وہ جاتا ہے کہ آئندہ زندگی میں اپنی محنت اور کوشش سے اس میں مزید اضافہ کرتا جائے۔ یہ نصاب عموماً حسب ذیل ہوتا ہے۔

۱۔ قرآن کے چند پارے ترجمے کے ساتھ پڑھنے اور اس داخلِ نصاب حصے کے اہم مضامین کا تفصیلی مطالعہ کرنا۔

۲۔ معین تعداد میں احادیث کو ترجمے اور تشریح کے ساتھ سمجھنا۔

۳۔ فقہ کے کچھ موضوعات کا تفصیل سے مطالعہ کرنا۔

۴۔ تاریخ اسلام کی ابتدائی پانچ چھ صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنا' جس میں سیرت النبیؐ اور خلافتِ راشدہ جیسے ہدایت دینے والے دور بھی شامل ہیں۔

۵۔ اسلامی نظامِ حیات کا مطالعہ کرنا جس سے اسلامی تہذیب وتمدن کے بنیادی اصول اور امتیازی خصوصیات' اسلامی نظامِ اخلاق' اسلامی معاشرے کے مختلف طبقات کے باہمی حقوق وفرائض' اسلام میں علم کی اہمیت' اسلامی اخوت' جہاد کی ضرورت وغیرہ مفید موضوعات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

۶۔ پھر قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم کو آسان کرنے کے لیے عربی گرائمر کا کچھ حصہ بھی نصاب میں داخل ہے اور طالب علموں کو یہ بھی سیکھنا ہوتا ہے۔

۷۔ ایسے ہی کچھ اور موضوعات بھی داخلِ نصاب ہیں جو کتاب وسنت کا علم حاصل کرنے میں امداد دیتے ہیں۔

یہ نصاب صرف عام کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو طالب علم یونیورسٹی کی سطح پر اسلامی علوم پڑھتے ہیں یا جو دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اس سے بہت زیادہ کچھ سیکھتے ہیں۔ اب اگر صرف کالجوں کی سطح پر پڑھائے جانے والے دینی علوم ہی کو صحیح طریقے سے پڑھایا جائے اور پورے شوق سے پڑھا جائے تو اسی سے انشاءاللہ ایسی مضبوط بنیاد بن سکتی ہے جو بقیہ زندگی کے لیے اس قابل بنا دے گی کہ انسان بطور خود اپنے علمِ دین میں اضافہ کرتا چلا جائے۔ جو طالب علم قرآن کے چند پارے اور احادیث اور فقہ کے معین حصے ترجمے اور تشریح کے ساتھ پڑھ لے اور ساتھ ہی اس نے ضروری عربی گرائمر بھی پڑھی ہو تو اس کے لیے پھر مزید علم دین حاصل کرنے کی راہ میں کوئی بڑی دقت نہیں رہتی' کیونکہ خدا کی مہربانی سے اردو زبان میں کلام پاک کی تفاسیر' احادیث کے ترجمے

اور اسلامی احکام اور اسلامی نظام زندگی کے بارے میں اعلیٰ پائے کا ادب موجود ہے۔

لہٰذا اسلامیات کے طالب علموں کا یہ مقصد نہیں ہونا چاہیے کہ انہوں نے بورڈ یا یونیورسٹی کے امتحانات میں اچھے نمبر لینے ہیں بلکہ وہ اس مضمون کو اس خیال سے پڑھیں کہ جو علم دین انہوں نے زندگی بھر حاصل کرتے رہنا ہے' اس کے لیے اب ایک مضبوط بنیاد قائم کرنی ہے اور خدا کے حضور میں جا کر اعلیٰ نمبر لینے ہیں' باقی رہے دنیا کے اعلیٰ نمبر' تو وہ تو ان کے شوق اور جذبے کے جلو میں خود بخود ہی آ جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامیات کے طالب علموں کا اپنے نصاب سے پورا فائدہ اٹھانا ایک حد تک پڑھانے والوں کے صحیح اسلامی جذبے اور نفیس طرز تدریس کا نتیجہ بھی ہوتا ہے تاہم اصل فیصلہ کن شے طلبہ اور طالبات کا اپنا شوق اور لگن ہے' کیونکہ اچھے سے اچھا استاد بھی بدشوق اور لاپروا طالب علم کو علم گھول کر پلانے سے معذور ہوتا ہے۔ اسلاف کی طلب علم کے جو واقعات اوپر گزر چکے ہیں ان پر غور کیا جائے کہ ان علم کے شیدائیوں نے دینی علوم حاصل کرنے کے لیے کس طرح مشقتیں جھیلیں' لمبے لمبے سفر کیے' سردی گرمی کی تکالیف سہیں۔ مفلسی اور فاقہ کشی کی اذیتیں برداشت کیں' پھر کہیں جا کر انہیں یہ علوم حاصل ہوئے۔ ان کے مقابلے میں ہمیں تو گویا آرام سے گھر بیٹھے علم مل رہا ہے۔ پھر بھی اگر ہم سستی اور لاپروائی کا ثبوت دیں تو کس قدر افسوس کا مقام ہے۔

☆ جو درسگاہوں سے محروم ہیں: یہ گزارشات تو ان لوگوں کے لیے تھیں جو درسگاہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ تو اقلیت میں ہیں' امت کی غالب اکثریت تو انہیں لوگوں پر مشتمل ہے جو علمی اداروں میں پڑھنے نہیں جاتے اور حصولِ علم کے لیے انہیں درسگاہوں یا ان کے اساتذہ کی امداد حاصل نہیں۔ یہ لوگ یا تو وہ ہیں جن کا پہلے درسگاہوں سے تعلق تھا' مگر اب تعلیم ختم کر کے انہیں چھوڑ چکے ہیں اور زندگی کے دوسرے

فرائض ادا کرنے میں مصروف ہیں یا پھر وہ ہیں جن کا کبھی کسی درس گاہ سے تعلق نہیں رہا اور ان کی علمی قابلیت معمولی نوشت وخواند تک محدود ہے۔ ایک بہت بڑا گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو معمولی نوشت وخواند کی قابلیت بھی نہیں رکھتے اور بالکل ان پڑھ ہیں۔

جیسے کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ درس گاہیں حصول علم کے سلسلے میں بہت امداد دیتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے بغیر کوئی علم حاصل کر ہی نہیں سکتا جن لوگوں کے حالات کتاب کے شروع میں بیان کیے جا چکے ہیں اور جو علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے' وہ بھی ایسے نہیں تھے کہ انہوں نے با قاعدہ درسگاہوں سے علم سیکھا ہو۔ اصل شے تو سچی طلب اور لگن ہے' جہاں یہ ہوگی وہاں انسان درسگاہوں کے بغیر بھی حصولِ علم کے بہت سے دروازے کھولنے میں کامیاب ہو جائے گا' اور جہاں یہ طلب اور لگن نہ ہوگی وہاں درس گاہیں بھی زیادہ مفید نہ ہو سکیں گی۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بہت سے ''طالب علم'' درس گاہوں میں پڑھ کر اور اسناد حاصل کر کے بھی جاہل کے جاہل ہی رہتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں حصولِ علم کے جو طریقے بیان کیے گئے ہیں وہ درحقیقت ایسے ہی لوگوں کے لیے ہیں جن کے دلوں میں علم کی طلب اور لگن موجود ہے اور یہ طریقے سوجھے ہی اس طرح ہیں کہ معاشرے میں علم کے بعض سچے طالبوں کو ان طریقوں سے علم حاصل کرتے دیکھا گیا ہے اور انہیں اس خیال سے پیش کیا جا رہا ہے کہ بسا اوقات ایک انسان کا تجربہ بے شمار دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے دین کا ضروری علم حاصل کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے اور اگر اسے اس کا احساس نہیں' جیسے کہ اس وقت اکثریت کو نہیں ہے' تو پھر وہ صریحاً خسارے کی راہ پر چل رہا ہے۔ جو اس خسارے سے بچنا چاہتا ہے اور جس کی یہ قلبی خواہش ہے کہ وہ:

۱۔ خدا کی کتاب کو ترجمے اور تشریح کے ساتھ اچھی طرح سمجھے اور اُسے نازل کیے

جانے کا مقصد معلوم کرے۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھ کر معلوم کرے کہ اُنہوں نے کس طرح قرآن پر عمل کر کے لوگوں کو صحیح اسلامی زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا تھا۔

۳۔ اسلام کے اوامر اور نواہی کو جانے اور ان شرعی سزاؤں کا علم حاصل کرے جو گناہوں کا ارتکاب کرنے سے عائد ہو جاتی ہیں۔

۴۔ دین کے احکام کے اغراض و مقاصد کو سمجھے اور ان دینی اور دنیاوی مصلحتوں کو معلوم کرے جو ان احکام کے ساتھ وابستہ ہیں۔

۵۔ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کے نشیب و فراز کا علم حاصل کرے اور دیکھے کہ کس طرح اسلام کو بحیثیت دین اختیار کرنے والوں نے اس کے اصول و احکام پر عمل کر کے ترقی اور سر بلندی حاصل کی ہے اور ان سے روگردانی کر کے ذلت و رسوائی کی مصیبتیں سہی ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔

۶۔ ان مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں'
اور مومن مردوں اور مومن عورتوں'
اور اطاعت شعار مردوں اور اطاعت شعار عورتوں'
اور راست باز مردوں اور راست باز عورتوں'
اور صابر مردوں اور صابر عورتوں'
اور خدا کے آگے جھکنے والے مردوں اور خدا کے آگے جھکنے والی عورتوں'
اور خیرات کرنے والے مردوں اور خیرات کرنے والی عورتوں'
اور روزے رکھنے والے مردوں اور روزے رکھنے والی عورتوں'
اور پاکدامن مردوں اور پاکدامن عورتوں'

اور خدا کا کثرت سے ذکر کرنے والے مردوں اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتوں کے حالاتِ زندگی معلوم کریں، جن کے اوصاف حمیدہ کے باعث انہیں یہ رتبہ حاصل ہوا کہ:

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا. (احزاب : ۳۵)

"اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔"

۷۔ اور تبلیغ اور حکمت تبلیغ کے اصول قاعدوں کو اچھی طرح سمجھیں تا کہ خدا کے اس دین کو، جو انسانیت پر سب سے بڑی رحمت ہے، دوسرے انسانوں تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں۔

جن لوگوں کے دلوں میں یہ جذبہ موجود ہے انہیں آئندہ بیان کیے جانے والے طریقوں میں سے کوئی نہ کوئی طریقہ انشاءاللہ ضرور فائدہ پہنچائے گا اور عجیب نہیں کہ ان کے حالات اس بات کی اجازت دیتے ہوں کہ وہ ایک سے زیادہ طریقے اختیار کر کے اپنے آپ کو زیادہ علمی فائدہ پہنچائیں۔



حصولِ علم کے ذرائع:۲

مطالعہ

جو شخص لکھنا پڑھنا جانتا ہو اس کے لیے حصولِ علم کا ایک کامیاب طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے روزمرہ کاموں میں مطالعے کو ایک معین جگہ ضرور دے۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات لگتی ہے' مگر درحقیقت یہ ایک حیرت انگیز اثرات پیدا کرنے والا عمل ہے بشرطیکہ اس میں پوری مداومت برتی جائے۔ اس کی صحیح اور پوری افادیت کا پتہ اسی صورت میں چل سکتا ہے کہ اس پر پوری باقاعدگی سے عمل کیا جائے۔

جیسے کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے' خدا کے فضل سے ہماری قومی زبان میں دین اسلام کے بارے میں بڑا تفصیلی اور اعلیٰ پائے کا ادب تیار ہو چکا ہے اور اس میں ان کتابوں کی بھی کمی نہیں جو ایسی عام فہم زبان میں ہیں کہ ہر نوشت و خواند کی قابلیت رکھنے والا انسان انہیں پڑھ کر سمجھ سکتا ہے۔ پڑھنے والے کی علمی سطح جس پائے کی ہو گی اسے اسی پائے کی کتب مل جائیں گی جنہیں پڑھ کر وہ اپنی دینی معلومات بڑھا سکتا ہے۔ کتب کے علاوہ ایسے دینی رسائل بھی شائع ہوتے ہیں جو دین کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔

علم کا سرچشمہ تو خدا کی کتاب ہے اور الحمدللہ کہ اردو زبان میں قرآن کے ترجمے اور تفسیر کا کام اتنے وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے کہ انشاءاللہ قرآن کے کسی طالب علم کو' اگر اس کی طلب سچی ہے اور اس میں ثابت قدمی موجود ہے تو کوئی واقعی دقت پیش آنے کا خطرہ نہیں۔ لفظی ترجمے بھی موجود ہیں' بامحاورہ بھی اور وہ بھی جنہیں ترجمے کے بجائے ترجمانی کہنا غلط

نہ ہوگا۔ تفاسیر میں بھی ہر قسم کی تفاسیر موجود ہیں۔ عام فہم زبان میں بھی اور مشکل اور عالمانہ زبان میں بھی۔ اردو کی جدید تفاسیر کے علاوہ عربی کی قدیم مشہور تفاسیر کے بھی اردو میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ عام فہم زبان کی جدید تفاسیر میں ''تفہیم القرآن'' کو جو مقام حاصل ہے، اس کا ہر انصاف پسند شخص معترف ہے۔ اگر ایک عام پڑھا لکھا انسان قرآن کے کسی لفظی ترجمے اور کسی بامحاورہ ترجمے اور چند تفاسیر کو سامنے رکھ کر قرآن کا مطالعہ کرے تو انشاء اللہ اسے خدا کی کتاب کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، حدیث کی چھ صحیح ترین کتابوں یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن نسائی اور اس کے علاوہ موطا امام مالکؒ مشکوٰۃ المصابیح، ریاض الصالحین وغیرہ سب کا اردو میں ترجمہ ہو چکا۔ پھر دین کا درد رکھنے والے مصنفین میں سے بعض نے موجودہ لوگوں کی ضرورت اور ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے منتخب احادیث کے مجموعے، ترجمے اور تشریح کے ساتھ مرتب کیے ہیں۔ جن میں سے ''معارف الحدیث'' کا نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔ حدیث کو سمجھنے کے لیے اردو میں ایک انتہائی مفید کام جو ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کی ایک لغات مرتب کرلی گئی ہے جس کا نام ''لغات الحدیث'' ہے۔ یہ لغات چھ جلدوں میں ہے اور علم حدیث کے شائقین کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جو لوگ عربی لغات کا استعمال نہ جانتے ہوں، وہ کسی عربی دان سے اسے استعمال کرنے کا طریقہ سمجھ لیں تو پھر انشاء اللہ یہ لغات حدیث کے معاملے میں اُن کے لیے ایک قابل استاد ثابت ہوگی۔

ایسے ہی چوٹی کے علماء اسلام کے نظامِ حیات کے ہر پہلو کے بارے میں نفع بخش ادب پیدا کر رہے ہیں۔ پاکستانی علماء کے علاوہ علمائے سلف اور دوسرے ممالک کے اسلام دوست علماء کی بہت سی کتب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا جا چکا ہے جن میں قرآن، حدیث، فقہ،

کلام، تاریخ اور دوسرے دینی علوم کی کتب موجود ہیں۔ اردو کے اسلام دوست مصنفین نے اسلامی تہذیب وتمدن، سیاست، معیشت، معاشرت، اخلاق وغیرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ اردو زبان میں کتنا دینی سرمایہ موجود ہے۔ اس کا صحیح اندازہ اسی شخص کو ہوسکتا ہے جسے ان کتب کی تلاش رہتی ہو۔ یہ طلب وتلاش انشاءاللہ انہیں خود ہی اس سرمائے تک لے جائے گی۔ مگر جنہیں یہ طلب وتلاش نہیں ہوگی انہیں کبھی اس بات کا پتہ نہیں چلے گا کہ قیام پاکستان کی برکات میں سے ایک اہم برکت یہ ہے کہ پاکستان کی قومی زبان میں دینی ادب کا قابلِ قدر سرمایہ پیدا ہو گیا ہے!

یہاں کچھ واقعات اور بیانات نقل کیے جاتے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ علم بڑھانے کے لیے مطالعے کی عادت اور کتاب کو کیا حیثیت حاصل ہے۔

امام حدیث حضرت محمد بن اسمٰعیل کا حافظہ بے مثال تھا۔ ایک دفعہ ان سے پوچھا گیا کہ حافظے کو اچھا بنانے کا علاج کیا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ "برابر مطالعہ کرتے رہو اور بس۔" اچھے حافظے کا یہی تو پھل ہوتا ہے کہ علم زیادہ ہو جاتا ہے، ایسے ہی برابر مطالعہ کرتے رہنے والے شخص کے علم میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ تسلسل کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت لقمان حکیم سے دریافت کیا گیا کہ دنیا میں سب سے زیادہ مالدار کون ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ جو اپنے مال پر سب سے زیادہ قناعت کرنے والا ہو۔ پھر پوچھا گیا کہ دنیا میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ تو فرمایا کہ سب سے بڑا عالم وہ ہے جو دوسروں کے علم کے برابر اپنے علم میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ مطالعہ کرتے رہنے والے کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی لکھی ہوئی کتب وغیرہ پڑھتے رہنے کے باعث اُن کے علم کو اپنے علم میں ملاتا رہتا اور اپنے علم میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

امام ابن جوزیؒ چھٹی صدی ہجری کے یکتائے روزگار مفسر، محدیث، مورخ، ناقد، مصنف اور خطیب تھے۔ آپ نے مطالعہ کتب کے بارے میں فرمایا ہے:

''میری طبیعت کتابوں کے مطالعے سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی۔ جب کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا۔ اگر میں کہوں کہ میں نے بیس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے۔ مجھے ان کتابوں کے مطالعے سے سلف کے حالات و اخلاق، ان کی عالی ہمتی، قوتِ حافظہ، ذوقِ عبادت اور علومِ نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا جو ان کتابوں کے مطالعے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پوتے حضرت عبداللہؒ بہت مشہور عالم تھے۔ انہوں نے علم اور مطالعے کے شوق میں تنہائی اختیار کر لی تھی۔ قبرستان میں رہتے، ہاتھ میں کتاب ہوتی اور تنہا بیٹھے پڑھتے رہتے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ زندگی میں لوگوں سے الگ تھلگ قبرستان میں کیوں رہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ:

''میری نظر میں قبر سے زیادہ اچھا کوئی نصیحت کرنے والا نہیں، کتاب سے زیادہ دلچسپ کوئی رفیق نہیں اور تنہائی سے زیادہ بے ضرر کوئی ساتھی نہیں۔''

حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ میری عمر کے چالیس سال ایسے گزرے ہیں کہ سوتے جاگتے کتاب میرے سینے پر رہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اکثر دن دن بھر گھر ہی میں بیٹھے رہتے، صرف نماز کے لیے نکلتے اور نماز پڑھتے ہی فوراً گھر چلے جاتے۔ ایک دفعہ لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ حضرت گھر میں تنہا بیٹھے بیٹھے آپ کی طبیعت نہیں گھبراتی۔ فرمایا:

''گھبرانا کیسا، میں تو ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیارے صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھا رہتا ہوں۔'' لوگوں نے تعجب سے کہا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ اب کہاں۔''

حضرت عبداللہؒ نے فرمایا کہ "میں حدیث کے مطالعے میں مشغول ہو کر ان کی صحبت میں پہنچ جاتا ہوں، ان کی مجلس میں شریک ہو کر ایک ایک بات دیکھتا ہوں، ان کی بات چیت سنتا ہوں۔ حدیث کے آئینے میں ان کی پوری زندگی میرے سامنے ہوتی ہے۔"

جن لوگوں کو مطالعے کی اہمیت اور افادیت کا پورا احساس ہوتا تھا، ان کے نزدیک ان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ان کی کتابیں ہوتی تھیں۔

ابن عمید کتابوں کے عاشق تھے۔ ایک دفعہ جنگ کے موقع پر فوجوں نے ان کے گھر پر حملہ کر دیا اور گھر کا سب سامان لوٹ لیا۔ اس بربادی میں ابن عمید کو اگر فکر تھی تو اپنے کتب خانے کی جس میں اتنی کتابیں تھیں کہ ایک سو اونٹ انہیں بمشکل اٹھا سکتے تھے۔ جب ابن عمید نے اپنے کتب خانے کے نگران کو دیکھا تو اس سے کتب خانے کا حال پوچھا۔ پتہ چلا کہ وہ بالکل صحیح سالم ہے۔ اس پر ابن عمید کا چہرہ کھل اٹھا اور نگران سے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم نیک بخت نگران ہو۔ تمام دوسرے ساز و سامان تو دوبارہ مہیا ہو سکتے ہیں اور ان کا بدل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ذخیرے یعنی کتب خانے کا بدل ممکن نہیں ہے۔

ایسے ہی مطالعہ کتب کی قدر و قیمت جاننے والوں کے لیے کتاب سے بہتر کوئی ساتھی بھی نہیں ہوتا۔ احمد بن اسمٰعیل کہتے ہیں:

"کتاب رات کو باتیں کرنے والا ایک ایسا دوست ہے جو آپ کی مشغولیت (یعنی مطالعے) کی حالت میں باتیں چھیڑ کر باعثِ کلفت نہیں ہوتا اور آرام و فراغت کے وقت آپ کو بلا کر زحمت نہیں دیتا اور جب آپ اس سے ملنا چاہیں تو آپ کو کسی آرائش کی ضرورت نہیں اور کتاب ایک ایسا ہم نشین ہے جو آپ کی حد سے زیادہ تعریف نہیں کرتا اور ایک ایسا دوست ہے جو آپ کو دھوکا نہیں دیتا اور ایک ایسا رفیق ہے جو باعثِ ملال نہیں ہوتا اور ایک ایسا ناصح ہے جو آپ کو لغزش میں مبتلا نہیں ہونے دیتا۔"

اس سلسلے کا ایک اور از حد دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو درج ذیل ہے:

کسی خلیفہ نے ایک رات کسی عالم دین کو بات چیت کے لیے بلایا۔ جب ایلچی آیا تو دیکھا کہ وہ عالم دین کتابوں کے ایک بڑے ذخیرے میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ایلچی نے کہا کہ آپ کو امیر المومنین نے بلایا ہے۔ عالم نے کہا کہ امیر المومنین سے کہہ دو کہ میرے پاس بڑے بڑے علماء اور فلسفی بیٹھے ہیں' میں ان سے بات چیت کر رہا ہوں' جب فارغ ہوں گا تو آ جاؤں گا۔ ایلچی نے جا کر خلیفہ کو اطلاع دی تو اُس نے متعجب ہو کر کہا کہ وہ کون عالم اور فلسفی ہیں جو اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایلچی نے کہا خدا کی قسم' میں نے تو وہاں کسی کو نہیں دیکھا۔ خلیفہ نے دوبارہ ایلچی کو روانہ کیا اور تاکید کر بھیجی کہ ضرور آئیں۔ آخر وہ آ گئے تو خلیفہ نے پوچھا کہ وہ کون علماء ہیں جو آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ اس پر انہوں نے کچھ اشعار پڑھے' جن کا ترجمہ یہ ہے:

"وہ ساتھی ہیں جن کی باتیں ملول نہیں کرتیں۔ وہ خواہ حاضر ہوں یا غائب امین او قابلِ اعتبار ہیں۔

جب علیحدگی میں ملتے ہیں تو اُن کی باتیں نہایت نفع بخش ہوتی ہیں' غموں کو دُور کرنے میں معاون اور موید ہوتی ہیں۔

وہ اپنے علم کے ذریعے ہمیں سابقہ علوم سے مستفید کرتے ہیں اور اس کے ساتھ عقل و شائستگی اور حکمت و رائے سے بھی نوازتے ہیں۔

نہ آپ کو اُن سے کسی قسم کا کوئی کھٹکا ہوگا اور نہ بد اخلاقی کا ڈر اور نہ آپ کو ان کے ہاتھ اور ان کی زبان سے کسی نقصان کا ڈر ہوگا۔

اگر میں کہوں کہ وہ مر چکے ہیں تو بھی جھوٹا نہ ہوں گا اور اگر کہوں کہ وہ زندہ ہیں تو بھی کوئی مزاح نہ ہوگا۔"

یہ اشعار سن کر خلیفہ کی سمجھ میں آیا کہ علماء اور فلسفیوں سے اُن عالم کی مراد کتابیں تھیں۔

ابوالعباس احمد بن یحییٰ بن ثعلب نے تنہائی اختیار کرلی تھی اور لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم کردیا تھا۔ اُن سے کہا گیا کہ آپ کو تو لوگوں کی صحبت سے نفرت ہوگئی ہے۔ حالانکہ اگر آپ لوگوں سے ملتے جلتے تو وہ آپ سے فائدہ اٹھاتے اور آپ کو بھی اللہ تعالیٰ اُن سے فائدہ پہنچاتا۔ ابوالعباس یہ بات سن کر کچھ دیر سر جھکائے خاموش رہے اور پھر کچھ اشعار پڑھ دیئے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

''ہم بادشاہوں کی صحبت اختیار کریں تو وہ غرور اور تکبر سے پیش آئیں گے'
تاجروں میں بیٹھیں تو دل کے غریب ہو جائیں گے اور روپیہ گننے کے شغل میں پھنس جائیں گے'
مجبوراً اپنے گھروں کے ہو گئے ہیں اور علم کے حقائق سے کتابیں بھر رہے ہیں''۔

ایسے ہی محمد بن بشیر نے کتابوں کی تعریف میں اشعار کہے ہیں۔

''کیا ہی خوب ہم نشین ہیں کہ ان کے ہم نشین کو کسی برائی کا اندیشہ نہیں ہوتا'
نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں نہ بدکلامی سے پیش آتے ہیں'
ہمارے لیے حکمت کے خزانے چھوڑ گئے ہیں' جن کا فائدہ ہمیشہ باقی رہے گا'
تمہیں محکم آثار کی طلب ہو تو یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار ثقہ اور شریف راوی سنا رہے ہیں'
یا اگر عرب جاہلیت کا علم چاہو تو خود عربوں کی زبانی سن لو'
یا عجم کے حالات و آداب کو جاننے کی خواہش ہو تو وہ بھی یہاں (کتابوں میں) موجود ہیں۔

یہاں سب کچھ اس طرح ملتا ہے گویا ہم اُس بھولے بسرے (ماضی کے) زمانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں'
وہ لوگ (ان کتابوں کے مصنف) مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں' جو ہمارے لیے یہ سب علم وادب چھوڑ گئے ہیں۔"

اپنے نفس کا تزکیہ کرنے کے لیے بھی اچھی کتابوں کا مطالعہ ازحد مفید ثابت ہوتا ہے' کیونکہ جس طرح کسی نیک انسان کی صحبت میں رہنے کے باعث انسان غیر ارادی طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے' اسی طرح اچھی کتب کا مطالعہ بھی غیر محسوس طور پر دل میں اچھے خیالات کی پرورش کر کے سیرت کو سدھارتا چلا جاتا ہے۔ جس قسم کی کتب ہمارے زیر مطالعہ رہیں گی' اسی قسم کے خیالات دل و دماغ پر حاوی ہوتے چلے جائیں گے اور انجام کار عمل کو متاثر کر کے رہیں گے۔

اس کے علاوہ جو لوگ امتِ مسلمہ کے اصل فریضے یعنی خدا کے پیغام کو خدا کی مخلوق تک پہنچانے کی ادائیگی کا شوق رکھتے ہوں' انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ صحیح معنوں میں تبلیغ کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کی علمی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ تبلیغ کا حق ادا کرنے کے لیے ایک طرف تو ہمیں اسلام کا وسیع مطالعہ کرنا چاہیے اور دوسری طرف غیر اسلامی تصورات اور ان کی بنیاد پر پھیلے ہوئے معاملات اور انتظامات کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے اور اس کام کے لیے سنجیدہ اور وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ تبلیغ دین کی ضرورت کا احساس رکھنے والوں کو اپنے وقت کا ایک حصہ ایسے مطالعے کے لیے وقف کرنا چاہیے جو سنجیدہ اور ٹھوس ہو اور جس کے لیے سوچنے' سمجھنے اور سیکھنے کی ضرورت ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ کتابیں اپنے لکھنے والوں کی ساری زندگی کے مطالعے اور تجربے کا نچوڑ پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے یہ علم اور یہ تجربہ اپنی پوری زندگی یا زندگی کا بہت بڑا حصہ

صرف کر کے حاصل کیا تھا اور ہم ان کی کتابیں پڑھ کر ان کے اس لمبی مشقت سے حاصل کیے ہوئے علم اور تجربے کو چند گھنٹوں یا چند دنوں یا چند ہفتوں میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اتنے نفع بخش کام سے لاپروائی برتنا اور اس پر صرف کیے جاسکنے والے وقت کو نسبتاً غیر اہم امور پر صرف کر دینا اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جسے "اہم" اور "غیر اہم" یا "کم اہم" اور "زیادہ اہم" کی پہچان نہ ہو۔!



حصولِ علم کے ذرائع: ۳

دینی اجتماعات

حصولِ علم دین کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ دینی اجتماعات میں شرکت کی جائے اور وہاں کی کارروائی کو سن کر علم بڑھایا جائے۔ اس سلسلے کی ایک بڑی اہم چیز نمازِ جمعہ کا خطبہ ہے۔ اگرچہ خواتین کے لیے باجماعت نماز میں شریک ہونا اور جمعہ پڑھنا فرض نہیں تاہم مردوں کو اس بات کی اجازت بھی نہیں دی گئی کہ وہ عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی کنیزوں (یعنی عورتوں) کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے مت روکو۔ (مسلم)

لہٰذا خواتین کے لیے حصولِ علم دین کا ایک راستہ یہ ہے کہ وہ جمعے کی نماز میں شرکت کرتے ہوئے جمعے کا خطبہ سنیں جو احکامِ دین اور نصیحتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی مساجد میں قرآن و حدیث کے درس کا بندوبست ہوتا ہے۔ اس درس میں باقاعدگی سے شرکت کر کے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ''شرکت کرنے'' سے مراد یہ ہے کہ پوری توجہ سے درس کو سنا جائے اور یاد رکھنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔ یہ نہیں کہ بظاہر تو درس کے لیے گئے، مگر وہاں مسجد میں اپنی ہی باتیں شروع کر دیں اور درس سنا بھی تو بے دھیانی سے۔ سخت افسوس اور رنج کا مقام ہے کہ بعض خواتین درس بھی سنتی ہیں مگر اس طریقے سے کہ ساتھ ساتھ اپنے شغل یعنی غیبت کرنے اور بہتان لگانے سے بھی باز نہیں آتیں۔ اب اس کے بارے میں اس کے سوا کیا کہا جائے کہ وہ خواتین درس کے لیے مسجد میں جاتی تو ہیں مگر درس میں شریک نہیں ہوتیں، کیونکہ اگر انہوں نے سن کر بھی

نہیں سنا تو پھر انہوں نے گویا درس میں شرکت ہی نہیں کی۔

یہ وقت ضرور ہے کہ جن جن مساجد میں درس قرآن وحدیث کا بندوبست ہے ان سب میں ساتھ خواتین کے بیٹھنے کا بندوبست موجود نہیں مگر اس کا اصل سبب بھی خواتین کی اپنی دینی بدشوقی ہے۔ اگر کسی آبادی کی خواتین درس میں شریک ہونے کی واقعی خواہشمند ہوں اور مطالبہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ علاقے کی مسجد میں اُن کے لیے ضروری بندوبست نہ کیا جائے۔

اس کے علاوہ دین سے محبت رکھنے والے دردمند لوگوں نے عوام کو قرآن و حدیث کی تعلیمات سے واقف کرانے کے لیے جو مختلف ذرائع اختیار کر رکھے ہیں' اُن میں ایک بڑا مفید ذریعہ ہفتہ وار اجتماعات کا نظام ہے۔ ہفتے میں کوئی ایک دن مقرر کر لیا جاتا ہے اور ارد گرد کی آبادی کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس مقررہ دن مقررہ وقت پر ایک معین گھر میں جمع ہو جائیں۔ پھر ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا جاتا ہے۔

خدا اور خدا کے رسولؐ سے محبت اور آخرت پر شعوری یقین رکھنے والی بہت سی اسلام دوست بہنوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں ہفتہ وار اجتماعات کا یہ نظام قائم کر رکھا ہے۔ ان اجتماعات میں قرآن اور حدیث کا درس دیا جاتا ہے' دین کے ضروری امور سے واقف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اجتماعات میں شریک ہونے والی بہنوں کو مفید دینی لٹریچر بہم پہنچایا جاتا ہے۔ جن خواتین کے گھروں کے قریب ایسے اجتماعات ہوتے ہوں انہیں چاہیے کہ ان سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کریں اور دل سے اس بات کی قدردان ہوں کہ انہیں علم دین سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ گھروں کی ذمہ داریاں اپنی جگہ ضرور ایک رکاوٹ ہیں' مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم عورتیں گپیں مارنے اور لوگوں پر فضول نکتہ چینیاں کرنے میں گھنٹوں کے گھنٹے ضائع کر دیتی ہیں اور اس وقت ہمیں گھروں کی ذمہ داریاں ذرا بھی یاد نہیں آتیں۔

ہفتہ وار اجتماعات کا یہ نظام علم دین کی اشاعت کے سلسلے میں قابلِ قدر خدمات انجام دے سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ خواتین کی عام دینی اور علمی بے حسی کے باعث یہ بعض

اوقات اپنا پورا فائدہ دینے سے قاصر رہتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی حلقہ قائم کیا جاتا ہے تو کچھ دن تو خواتین شوق سے آتی ہیں' پھر بے حسی اور بدشوقی کا شکار ہو جاتی ہیں اور حاضری بہت کم ہو جاتی ہے تو بعض اوقات حلقہ چلانے والی خاتون کو وہ حلقہ بند کرنا پڑ جاتا ہے تاکہ اپنے وقت کو خدمتِ دین کے کسی ایسے کام پر صرف کریں جس سے زیادہ نتائج پیدا ہوں۔ جہاں جہاں بھی کسی آبادی میں علمی اور دینی شوق پایا جاتا ہے وہاں یہ نظام بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ جن خواتین کے گھروں کے قریب کوئی ایسا حلقہ قائم ہو اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں سستی برتیں' تو یہ ازحد افسوس کی بات ہی نہیں بلکہ ان کی بے نصیبی کی دلیل بھی ہے۔

خصوصاً وہ خواتین جو سمجھ دار اور اچھے ذہن کی مالک ہیں۔ انہیں تو ایسے مواقع کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ فراء کا قول ہے:

"مجھے دو آدمیوں پر بڑا رحم آتا ہے۔ اس پر جو علم حاصل کرنا چاہتا ہے مگر سمجھ نہیں رکھتا اور اس پر جو سمجھ رکھتا ہے مگر علم حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں پر سخت تعجب ہے جو علم حاصل کرنے کی مقدرت رکھتے ہیں' مگر علم حاصل کرتے نہیں۔"

ہفتہ وار اجتماعات کے علاوہ بعض خواتین نے اپنے گھروں میں چھوٹی موٹی درسگاہیں بھی قائم کر رکھی ہیں اور بچوں اور مردوں کے گھروں سے چلے جانے کے بعد وہ شوقین خواتین اور لڑکیوں کو قرآن پاک کے ترجمے اور تشریح کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان دین کی خدمت گزار خواتین کے نام پیش نہیں کیے جا سکتے۔ کیونکہ وہ اس اشتہار کو پسند نہیں کریں گی۔ مگر دعا ہے کہ جہاں جہاں بھی یہ خدمت ہو رہی ہے' خدا تعالیٰ اسے شرفِ قبولیت بخشے' ان اسلام دوست خواتین کو اجر و ثواب سے نوازے اور عوام کو توفیق بخشے کہ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

حصول علم کے ذرائع:۴

کچھ اور مفید ذرائع

درس گاہوں میں داخلہ لینے' ذاتی طور پر مطالعہ کرنے اور دینی اجتماعات میں شرکت کرنے کے علاوہ کچھ اور ذرائع بھی ایسے ہیں جن سے علم حاصل کیا جاسکتا ہے اور جو لوگ علمِ دین کے واقعی شائق ہیں' وہ ان ذرائع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

☆علم والوں کی صحبت: اس سلسلے میں ایک مفید ذریعہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ملنے ملانے اور اٹھنے بیٹھنے کا جو حلقہ چنے وہ اہلِ علم کا ہو۔ عموماً لوگ اپنے رشتے داروں کے حلقے پر قانع نہیں رہتے اور دوستی اور محبت کے لیے مزید لوگوں کا انتخاب کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بس یہ انتخاب عقلمندی کا ہونا چاہیے۔ کیونکہ رشتے داری تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے' جیسے بھی رشتے دار مل گئے' مل گئے' انہیں بدلا نہیں جاسکتا' مگر دوست احباب اور ملنے ملانے والے لوگ انسان خود چنتا ہے۔ اب اگر ہمارا یہ حلقہ ایسا ہوگا جہاں ہر وقت زیورات کی' کپڑوں کی نت نئے فیشنوں کی' فلموں کی اور لوگوں کی عیب جوئی ہی کی باتیں ہوں گی' تو ہم غیر ارادی طور پر اس سے متاثر ہوتے چلے جائیں گے اور انہیں اشیاء کو زندگی کا مآل سمجھنے لگیں گے اور ویسے ہی عیب جو ہو جائیں گے جیسے ہمارے حلقے کے لوگ ہوں گے۔ لیکن اگر یہ حلقہ ایسے لوگوں کا ہوا' جن میں علم دین حاصل کرنے اور اس کی اشاعت کرنے کی تڑپ ہوئی تو وہاں کی عام طور پر ہونے والی گفتگو ہی سے ہم بہت کچھ حاصل کرتے چلے جائیں گے۔ حقیقت

یہ ہے کہ نیکی اور بدی' اچھائی اور برائی' علم اور جہالت' ذوقِ نفیس اور ذوقِ فضول' مفید میلانات اور مضر میلانات' یہ سب متعدی چیزیں ہیں اور اپنے اردگرد لازماً اپنے اثرات پھیلا کر رہتی ہیں۔ علم والے لوگوں کی گفتگو کے موضوعات ہی ایسے ہوتے ہیں جو پاس بیٹھنے والوں کو بہت کچھ علمی اور دینی فوائد پہنچا دیتے ہیں۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ اب تیری دانائی کس منزل پر ہے۔ بیٹے نے جواب دیا کہ بے فائدہ باتوں سے پرہیز کرنے لگا ہوں۔ حضرت لقمانؑ نے کہا کہ ابھی ایک کسر باقی ہے۔ وہ یہ کہ علم رکھنے والوں کی صحبت میں بیٹھو' کیونکہ خدا دانائی کے نور سے مردہ دلوں کو اس طرح زندہ کر دیتا ہے جس طرح مینہ سے مردہ زمین کو۔

☆ **ذرائع ابلاغ:** ایسے ہی ذرائع ابلاغ مثلاً اخبارات' ریڈیو وغیرہ بھی ایک حد تک علم بہم پہنچانے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ اخبارات کی خاص اشاعتوں میں اور بسا اوقات عام اشاعتوں میں بھی علمی اور دینی موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین خاصے مفید ہوتے ہیں۔ جہاں تک ریڈیو وغیرہ کا تعلق ہے اگرچہ اس کے پروگراموں کے اکثر حصوں کا علم سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا' تاہم ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو مشتاقانِ علم کے لیے بہت مفید ہوتی ہیں اور اگر انسان ایسا بندوبست کرے کہ فضولیات کو چھوڑ کر مفید چیزوں کو سن لیا کرے تو یہ بہت کچھ فائدے کا باعث بن سکتا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر سننے والے اچھے اور مفید پروگراموں میں دلچسپی لیں اور ان کے لیے مطالبے کرتے رہیں تو شاید انچارج لوگ بھی اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس کریں اور پروگراموں کو زیادہ دلچسپ بنانے ہی کو مقصد قرار دینے کے بجائے انہیں زیادہ مفید بنانے کی کوشش بھی کریں۔

☆ **پرائیویٹ بندوبست:** پھر حصولِ علم کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ جو لوگ مالی استطاعت رکھتے ہوں' وہ پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم کے لیے کوئی بندوبست کر لیں۔ ایک بال بچوں والی

گھر دار خاتون کو دیکھا گیا کہ انہوں نے قرآن کا علم حاصل کرنے کے لیے ایک عالم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ یہ ان کے شوقِ علم کا نتیجہ تھا' ورنہ وہ بال بال ذمہ داریوں میں جکڑی ہوئی تھیں اور اگرچہ درمیانے درجے کی خوشحال تھیں۔ تاہم انہیں کے پائے کی اور بیشمار خوشحال خواتین ہوں گی جن کے پاس نئے نئے جوڑے بنانے اور گھر میں فضول کاٹ کباڑ اکٹھا کرنے کے لیے تو پیسے نکل آئیں گے' مگر اپنی تعلیم پر خرچ کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو تنگدست پائیں گی۔ حالانکہ جو رقم حصولِ علم پر خرچ ہو وہ ایک انتہائی مفید اور مبارک مصرف پر صرف ہوتی ہے اور اجر و ثواب اور عقل و دانائی کا ذریعہ بنتی ہے۔ حکیم جالینوس سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ دانائی کیسے حاصل کر لی۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے کتابیں پڑھنے کے لیے چراغ پر اس سے زیادہ خرچ کیا ہے جتنا وہ شراب پر خرچ کرتے ہیں۔

یہ جو کچھ پیش کیا گیا ہے صرف چند تجاویز ہیں جنہیں علم دین کے حصول کا واقعی شوق ہو گا وہ اپنے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حصولِ علم کے اور بھی طریقے سوچ سکتے ہیں۔



حصولِ علم کے ذرائع:۵

راہ کی مشکلات اوران کا حل

ان سطور کو پڑھتے ہوئے یہ نہ سمجھا جائے کہ حصولِ علم کی تاکید کرتے ہوئے ان مشکلات کا احساس نہیں جو اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ زمانہ طالب علمی کے بعد علم حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں' اس مبارک کام کی راہ میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں۔

سب سے پہلی دقت تو وقت کا مسئلہ ہی ہے۔ مطالعہ کرنا ہو یا دینی اجتماعات میں شرکت کرنی ہو یا ذرائع ابلاغ میں سے کسی ذریعے سے فائدہ اٹھانا ہو یا اہلِ علم کی صحبت اختیار کرنی ہو یا پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم کا کوئی بندوبست کرنا ہو' ہر صورت میں وقت کی ضرورت ہے اور ایک متوسط درجے کے انسان کی زندگی میں ناگزیر فرائض ہی کی مصروفیت اتنی ہوتی ہے کہ اس کے لیے وقت نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ایک خاتون بڑے ذوق وشوق سے اپنی ایک واقف کار کے گھر آئیں' جن کا علومِ اسلامیہ کی تدریس سے تعلق تھا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ انہیں کلام پاک کا ترجمہ اور تشریح پڑھا دیا کریں۔ مگر ان خاتون کی زندگی میں مصروفیات کی وہ بھرمار تھی کہ انہیں معذرت کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اب پڑھنے کی خواہش رکھنے والی خاتون بھی بہت دل شکستہ ہوئیں اور معذرت کرنے والی ان سے بھی زیادہ پریشان تھیں کیونکہ وہ واقعی وقت نہیں دے سکتی تھیں اور اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ اگر انہوں نے وعدہ کرلیا اور پھر ٹھیک طرح سے پڑھا نہ سکیں تو جو بیچاری اپنی ذمہ

داریاں چھوڑ کر اور مشکل سے کچھ وقت نکال کر اُن کے گھر آیا کریں گی، وہ اپنے وقت کے ضائع ہونے پر اور زیادہ دل شکستہ ہوں گی۔

ایسے ہی بسا اوقات مالی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ علم کی راہ میں کچھ صرف کر سکیں۔ پڑھنے کے لیے بہر حال کتب وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں آنے جانے کے لیے بھی کرایوں کے لیے معقول رقم درکار ہوتی ہے کیونکہ معاشرے میں ایسے گھرانے تو بہت کم ہیں جہاں ذاتی سواریاں موجود ہوں اور باہر کی سواریاں لینے کے لیے کرائے کی رقم کے علاوہ فالتو وقت بھی درکار ہوتا ہے کیونکہ عموماً سواری بڑے انتظار کے بعد ملتی ہے۔

ایسے ہی بسا اوقات انسان پڑھنے کا تو خواہشمند ہوتا ہے مگر پڑھانے والے نہیں ملتے جیسے کہ مندرجہ بالا واقعے سے ظاہر ہے۔ ذاتی مطالعے کی صورت میں بھی یہ بات پیش آسکتی ہے کہ کوئی ایسا مشکل لفظ آجائے جس کا مفہوم لغات سے بھی حل نہ ہوتا ہو یا کسی مصنف نے کسی مسئلے پر اس انداز سے تبصرہ کیا ہو کہ وہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آتی ہو اور ضرورت ہو کہ کوئی بہتر علم رکھنے والا اسے سمجھائے۔

پھر خواتین کی راہ میں ایک اور جان لیوا دقت یہ بھی آتی ہے کہ جاہل گھرانوں ہی میں نہیں بلکہ بعض علم والے گھرانوں میں بھی عموماً مرد اس بات کو برداشت نہیں کرتے کہ عورتیں کتاب بینی میں مصروف رہیں یا اپنے روزمرہ کے فرائض میں سے کچھ وقت بچا کر اپنے پڑھنے لکھنے پر صرف کریں۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ذرائع ابلاغ سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ بھی کوئی آسان کام نہیں، کیونکہ ریڈیو وغیرہ کے پروگرام کے مفید حصے جتنے بھی ہیں وہ کسی ایک وقت میں جمع نہیں ہوتے بلکہ مفید حصے غیر مفید حصوں کے درمیان بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مفید حصوں کے دن اور اوقات

حفظ ہوں اور پھر اپنے روزمرہ کے کاموں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اُن خاص اوقات میں فراغت میسر آجائے جو ہمیشہ ممکن نہیں ہوتی۔

غرضکہ خواتین کے لیے درسگاہوں کی امداد کے بغیر علم حاصل کرنے کی راہ میں گوناگوں مشکلات ہوتی ہیں اور انہیں حل کرنے کے لیے بڑے غور وفکر، عقلمندی اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ انسان ایک دوسرے کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک انسان کو کسی دقت کو دور کرنے کے لیے کوئی ایسی بات سوجھ جائے جو دوسرے کو نہ سوجھی ہو۔ لہٰذا حصول علم کی راہ میں آنے والی دقتوں کے سلسلے میں کچھ مفید تجاویز پیش کی گئی ہیں جو یہاں اس لیے درج کی جاتی ہیں کہ شاید علم کے کسی مشتاق کو ان سے کوئی فائدہ پہنچ جائے۔

☆ چند تجاویز: سب سے پہلے اہم بات یہ ہے کہ جب کوئی دقت پیش آئے تو ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ یہ دقت کیا واقعی کوئی بڑی دقت ہے یا کہ صرف ہمیں بڑی نظر آرہی ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ بہت سی دقتیں صرف ظاہر اطوار پر سخت نظر آتی ہیں فی الحقیقت سخت نہیں ہوتیں اور اگر انسان بتوفیق خداوندی دعا والتجا اور ثابت قدمی سے کام لیتا رہے تو وہ اس طرح غائب ہوجاتی ہیں کہ انسان خود حیران رہ جاتا ہے کہ آخر اس نے اتنی آسان بات کو اتنا مشکل کیوں سمجھا تھا۔

گذشتہ اوراق میں سلف صالحین کے حالات بیان کیے جاچکے ہیں کہ علم کی راہ میں انہوں نے کیا کیا فقر وفاقہ سہا اور کس طرح انہیں جنگلوں صحراؤں کو پیادہ پا طے کرنا پڑا۔ امام بخاریؒ کے حالات میں بیان ہوا ہے کہ طالب علم کے زمانے میں ایک دفعہ مفلسی نے ایسا گھیرا کہ تین دن تک جنگل کی جڑی بوٹیاں کھا کر گزارا کیا۔ ایسے ہی ابوحاتم رازی نے اپنی سرگذشت میں خود بیان کیا ہے کہ میں نے تین ہزار فرسخ سے زیادہ مسافت پیادہ پا طے

کی تھی۔ اس کے بعد میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا۔ فرسخ تین میل کا بتایا جاتا ہے۔ گویا نو ہزار میل پیادہ پا طے کرنے کے بعد بھی ابو حاتم رازی نے سفر جاری رکھا، مگر پھر میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا۔ علم کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیش آنے پر اپنے بزرگوں کی ان مشکلات کو یاد کر لینا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ ان کے مقابلے میں ہم نے حصول علم کے لیے جو کوشش بھی کرنی ہے، گھروں کے اندر یا آباد بستیوں میں کرنی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے بغیر کرنی ہے۔ ہمارے نیکوکار بزرگ ہمارے لیے روشن نمونے چھوڑ گئے ہیں اور ان میں ایک بڑا روشن نمونہ یہ ہے کہ حصول علم کی راہ میں مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے اور ان کے آگے ہتھیار نہ ڈالے جائیں۔ اس کتاب میں ان کے شوقِ علم اور علم کی راہ میں سختیاں سہنے کے واقعات اسی لیے پیش کیے گئے ہیں کہ انہیں بار بار پڑھا جائے اور ان کی پیروی کر کے اپنے اندر صبر اور حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

جہاں تک وقت کے مسئلے کا تعلق ہے بلاشبہ ہمارے کندھوں پر بہت ذمہ داریاں ہیں، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ جتنے کام ہم نے اپنے اوپر لازم کر رکھے ہیں، وہ سبھی ضروری نہیں اور جتنا وقت ہم باتوں پر صرف کر دیتے ہیں وہ سارا ضروری باتوں پر صرف نہیں ہوتا۔ ہماری باتوں میں سے بعض نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں ہوتیں بلکہ الٹی مضر ہوتی ہیں اور بہت سی ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے کر گزرنے کے باعث ہم ایسی الجھنوں میں پھنس جاتے ہیں جو ہمارے اور بھی بہت سے وقت کے ضائع ہو جانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر ہم زندگی میں اعتدال کے ساتھ سادگی اور گفتگو میں اعتدال کے ساتھ کمی کر لیں تو صرف یہی شے ہمارے وقت کے ایک اچھے خاصے حصے کو بچانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

یہاں لفظ ''اعتدال'' جو استعمال کیا گیا ہے، اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ جو کام اعتدال کو نظر انداز کر کے کیا جائے اس کی کامیابی کا امکان کم ہوتا ہے یا تو انسان خود

ہی اپنے بے اعتدالی والے پروگرام سے گھبرا کر اسے چھوڑ بیٹھے گا یا کم از کم اہلِ خانہ اور متعلقین تو اس پر ضرور ہی معترض ہوں گے اور ان کے اعتراضات بھی شدت اختیار کر کے اس پروگرام کی ناکامی کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی خانہ دار عورت بھی اس گھر کو جسے وہ ''اپنا گھر'' کہتی ہے، پورے طور پر اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتی۔ ایسے ہی کوئی والدین کے زیر سایہ رہنے والی لڑکی بھی اس گھر میں، جسے وہ بالکل اپنا شمار کرتی ہے، پورے طور پر اپنی مرضی کے مطابق نہیں رہ سکتی۔ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر گھر چلانے والی خاتون کو بھی اور گھر کی بہوؤں بیٹیوں کو بھی دوسرے اہلِ خانہ کی مرضی کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے وقت بچانے کے لیے جو پروگرام بھی بنایا جائے اس میں اعتدال ہونا لازمی ہے تا کہ اہلِ خانہ اس قدر زیادہ متاثر نہ ہوں کہ واویلا شروع کر دیں اور اس مقصد ہی کے دشمن ہو جائیں جس کی خاطر یہ اصلاحات کی جا رہی ہوں۔ راہ حق کی ایک مسافر خاتون نے، جو اب اپنے اللہ کے حضور میں پہنچ چکی ہیں، اپنا ایک تجربہ بتایا کہ میں نے تبلیغی سرگرمیوں کے لیے کچھ وقت بچانے کے لیے اپنے اہلِ خانہ کے کھانوں کے اوقات میں کچھ ردو بدل کیا تو اس پر اعتراض کرنے والے میرے وہ میاں تھے جنہوں نے پوری زندگی اللہ کی راہ میں وقف کر رکھی تھی۔ اگر ایسے بے غرض اور اسلام دوست انسانوں کا یہ حال ہو تو پھر عام متعلقین کے بارے میں کہاں تک توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اس معاملے میں خوشدلی سے تعاون کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ لہٰذا وقت بچانے کا جو بھی پروگرام ہو، عقلمندی سے بنایا جائے اور اس میں اعتدال کو مدنظر رکھا جائے۔

ویسے اگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ بہت کچھ تکلفات سے کام لینے اور ضرورت سے زیادہ بولنے کی ہم عورتیں خود ہی شوقین ہوتی ہیں۔ اگر ہم سادگی اور بولنے میں کمی کی کوشش اس اعتدال کے ساتھ کریں کہ دوسرے اہل خانہ پر برا اثر نہ پڑے تو بہت سے

متعلقین کو اس پر کچھ اعتراض نہ ہوگا اور خواتین کے سادگی اختیار کرنے کے پروگرام پر تو بلکہ بہت سے شوہر خوش ہی ہوں گے۔ اعتدال کے ساتھ سادگی اختیار کرنے کے معاملے میں بھی چند باتیں ذہن نشین کر لینی مفید ثابت ہوں گی۔

ایک یہ کہ عورت کے لیے اچھا لباس اور سنگھاری اشیاء استعمال کرنا کوئی ممنوع بات نہیں ہے۔ پابندی صرف یہ ہے کہ اپنے بناؤ سنگھار کو نامحرم آنکھوں کے سامنے نہ لایا جائے۔ باقی حیثیت کے مطابق اچھا لباس پہننا اور آرائش کرنا بالکل جائز شے ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسان کا اپنی اصل حیثیت سے بہت گر کر رہنے کو بھی کوئی نیکی شمار نہیں کیا گیا۔ جیسے کہ حضور کی ایک حدیث میں واضح فرمایا گیا ہے کہ خدا نے نعمت دے رکھی ہو تو اس کا اظہار ہونا چاہیے۔

اب ایک طرف تو ان دو باتوں کو پیش نظر رکھیں اور دوسری طرف یہ بھی دیکھیں کہ ریا اور دکھاوا کرنا، شیخی اور غرور کے لیے اظہار نمائش کرنا اور فضول خرچی کر کے دولت کو اڑانا بھی سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ ان دونوں اقسام کی ہدایات کو پیش نظر رکھیں تو خود ہی ایک معتدل اور درمیانی راہ نظر آجائے گی، جس میں دولت کو آگ لگا کر تماشا دیکھنے والی بات بھی نہیں ہوگی اور نہ صاحب حیثیت ہوتے ہوئے بھی برے حالوں رہنے کی صورت ہوگی۔ درمیانی باوقار چال کو ایک پسندیدہ چال سمجھا گیا ہے جس میں انسان کی حیثیت بھی نظر آجاتی ہے لیکن اس حیثیت کے ساتھ تبرج جاہلیت اور مغرورانہ نمود و نمائش بھی نہیں ہوتی۔

ایسے ہی گھروں کو صاف ستھرا رکھنا اور اہل خانہ کے جائز آرام اور آسائش کے سامانوں کا بندوبست کرتے رہنا ایک گھردار خاتون کا سگھڑاپہ اور سلیقہ ہے مگر اس میں بھی جب بے اعتدالی کی جاتی ہے اور گھر کو زیادہ سے زیادہ فرنیچر اور نمود و نمائش کی چیزوں سے بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا راحت و آرام اور سردی گرمی سے بچنے کے ایسے سامانوں

کے مہیا کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے جن کی گھر کی آمدنی متحمل نہیں ہوسکتی تو پھر گھر دار خاتون شوہر کی جیب اور اپنے ذہن اور وقت پر وہ ناقابلِ برداشت بوجھ ڈال لیتی ہے جس سے ایک طرف اس کا سکون اور دوسری طرف اس کی فرصت کے لمحات بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ گھروں میں اگر اشیاء کم ہوں اور صفائی اور نظم و ترتیب زیادہ ہو تو وہ کچھ کم خوبصورت نہیں لگتے۔ اور جتنی چیزیں کم ہوتی ہیں انہیں صاف اور مرتب رکھنے میں اتنے ہی کم وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر عمارت کا بہت بڑا ہونا بھی بسا اوقات آرام کے بجائے بے آرامی کا باعث بن جاتا ہے۔ بعض بہنوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے بڑے بڑے گھر ان کے لیے ایک مستقل دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ گھر جتنا بڑا ہوگا اس کے لیے اتنے ہی زیادہ ساز و سامان کی ضرورت ہوگی اور اسے صاف اور درست حالت میں رکھنے یا رکھوانے کے لیے اتنا ہی زیادہ وقت اور تردّد درکار ہوگا۔ ایسے گھروں کو دیکھ کر عربی زبان کا وہ مقولہ یاد آتا ہے کہ:

''ضرورت سے زیادہ عمارت انسان کے لیے وبال ہے!''

اسی طرح بعض اوقات ہمارا وقت اس لیے بھی ضائع ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو لایعنی کاموں میں الجھا دیتے ہیں۔ مثلاً دوسروں کے مخصوص حالات کی کرید کرنا یا ایسے معاملات میں اپنی خدمات پیش کرنا جہاں مقصود دوسروں کی امداد نہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار اور اپنی اہمیت جتانا ہو۔ یہ دونوں خواہشات اور ایسی ہی اور بہت سی خواہشات محض حماقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ زندگی کا وقفہ اتنا مختصر ہے اور اس میں کیے جانے والے کام اتنے زیادہ ہیں کہ ضروری کام ہی نمٹانے مشکل ہو جاتے ہیں۔ کجا یہ کہ انسان غیر ضروری کاموں کا بوجھ بھی اپنے اوپر لاد لے، محض ذوقِ فضول کے باعث یا محض اپنی اہمیت جتانے کی خاطر!

جامع ترمذی میں بیان ہوا ہے کہ حضرت امام حسینؓ نے حضرت علیؓ سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کے بارے میں سوال کیا۔ اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے

حضورؐ کے اخلاق کے بارے میں جو کچھ بیان کیا اس میں یہ بھی ہے کہ

''حضورؐ نے اپنے نفس سے تین چیزیں بالکل دُور کر دی تھیں۔

ا۔ بحث و مباحثہ کرنا'

۲۔ ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور

۳۔ جو بات مطلب کی نہ ہو اسی میں پڑنا۔

دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز فرماتے تھے۔

ا۔ کسی کو برا نہیں کہتے تھے'

۲۔ کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے' اور

۳۔ کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔

آپؐ وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا۔'' (ترمذی)

حضورؐ کا اپنا فرمان بھی ہے کہ:

''انسان کے اسلام کی خوبی میں یہ بات بھی ہے کہ وہ لایعنی چیزوں کو ترک کر دے۔'' (ترمذی)

اگر ہم لوگ صرف اسی اسوۂ حسنہ پر عمل کر لیں تو انشاء اللہ ہمارا بہت سا وقت محفوظ ہو جائے گا۔

حصولِ علم دین بہت ضروری ہے اور اس کی راہ میں مشکلات بھی آتی ہیں۔ مگر اللہ رب العٰلمین نے مشکلات کے ساتھ ان مشکلات کے حل بھی رکھے ہیں اور مشکلات کو حل کرنے کا سب سے زیادہ قیمتی نسخہ دعا و التجا ہے۔ مشکلات کی دُوری اور وقت کی برکت سب کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لہٰذا حصولِ علم دین کے لیے وقت اور اسباب حاصل کرنے کے لیے تدابیر ضرور کی جائیں' مگر اصل بھروسہ دعا و التجا پر رکھا جائے تو انشاء اللہ

کامیابی یقینی ہے۔

☆غم و پریشانی میں حصولِ علم: علم حاصل کرنے کے سلسلے میں اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ دل پرسکون ہو اور غم و فکر سے نجات حاصل ہو تو علم حاصل کیا جائے۔ زندگی کے نشیب و فراز اور ذمہ داریاں تو دل کو اکثر بے چین ہی رکھتی ہیں۔ اب اگر انسان اس انتظار میں رہے کہ جمعیت خاطر حاصل ہو تو علم کی طرف توجہ دی جائے تو جمعیت خاطر تو شاید ساری زندگی حاصل نہ ہو اور علم کو تو زندگی ہی میں حاصل کرنا ہے' موت کے بعد تو کسی بھی عمل نیک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا دل پرسکون ہو یا بے سکون' علم کی طرف توجہ رکھنی چاہیے اور جو موقع بھی ملے اس سے فائدہ حاصل کرنے کی سعی جاری رکھنے چاہیے۔ مختلف زبانوں کی بعض قابلِ قدر تصانیف اس وقت لکھی گئیں جب ان کے مصنف جیلوں میں بند تھے۔

شیخ بوعلی سینا کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ ایک دفعہ حکامِ وقت ان سے برہم تھے اور وہ جان کے خوف کے باعث روپوش تھے۔ اس حالت میں کچھ دنوں کے لیے کسی عطار کے گھر میں پناہ مل گئی اور انہوں نے وہیں سامانِ تحریر منگوا کر اپنی ایک کتاب لکھنی شروع کر دی۔ یہ وہی کتاب تھی جو بعد میں ''شفاء'' کے نام سے شہرۂ آفاق حیثیت کی مالک ثابت ہوئی۔

عربی زبان کے مشہور شاعر ابوتمام ایک دفعہ خراسان کے دربار کی طرف جا رہے تھے۔ راہ میں موسم اتنا خراب ہو گیا اور اس کثرت سے برف پڑی کہ راستے بند ہو گئے۔ ابوتمام کو ایک رئیس کے گھر ٹھہرنا پڑا۔ اس رئیس کے کتب خانے میں عرب شعراء کے بہت سے دیوان تھے۔ ابوتمام نے اس زبردستی کے قیام کی مدت کو ضائع کرنے کے بجائے وہ دیوان پڑھنے شروع کر دیے اور ان سے اشعار منتخب کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا' جو ''حماسہ''

کے نام سے مشہور ہوا۔ اس انتخاب نے اتنی شہرت حاصل کی کہ عربی ادب میں اسی کے باعث ابوتمام کا نام زندۂ جاوید ہو گیا۔ عربی ادب کے نقاد کہتے ہیں کہ ابوتمام خود اپنے کلام کی نسبت اپنے اس انتخاب میں زیادہ بڑا شاعر لگتا ہے۔

امام ابن جوزیؒ ایک دفعہ شہر واسط میں نظر بند تھے۔ اس وقت آپ کی عمر اسی برس کی ہو چکی تھی اور آپ کے علم و فضل کی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ اتفاق سے مشہور عالم ابن باقلانی بھی اُن دنوں واسط میں تھے۔ امام ابن جوزیؒ نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور امام باقلانی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت امام ابن جوزی کے صاحبزادے یوسف بھی آپ کے ہم سبق تھے۔

☆ **تدریج اور مداومتِ عمل:** حصولِ علم کے سلسلے میں دو اور باتیں بہت مفید ہیں۔ ایک یہ کہ ایک دم بہت سا علم حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ اس راہ کا سفر جاری رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ حصولِ علم کے لیے جو پروگرام بھی بنایا جائے وہ چاہے مختصر ہی ہو مگر اس میں ناغہ کرنے سے پرہیز کی جائے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پیارا عمل وہ ہے جس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے چاہے وہ تھوڑا ہی ہو۔" (مسلم)

زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح حصولِ علم کے سلسلے میں بھی یہ مداومتِ عمل کامیابی کی چابی ہے۔ تھوڑا تھوڑا علم حاصل کرنا مگر کرتے رہنا اس بات سے بدرجہا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ کہ کچھ دیر تو بہت پڑھا، مگر پھر اس میں لمبا ناغہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب پڑھا پڑھایا ذہن سے نکل گیا۔ اپنے حالات اور مصروفیات کو پیش نظر رکھ کر ایسا پروگرام بنانا چاہیے جو چلتا چلا جائے۔ اگر زندگی کی واقعی مصروفیات روز پڑھنے کی اجازت نہ دیں، تو ہفتے

میں چند دن مخصوص کر لیے جائیں' مگر کوشش یہی کی جائے کہ ان پر مداومت رہے۔ امام زہریؒ نے ایک طالب علم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"علم کو قدر تج کے ساتھ حاصل کر۔ لیل و نہار کی سست رفتاری کے ساتھ چل کر اسے گرفت میں لا' ایک مشت لینے کی کوشش نہ کر' کیونکہ جو کوئی یہ کوشش کرتا ہے' کچھ نہیں پاتا۔"

مطالعے اور مداومتِ عمل کی قدر و قیمت جاننے والے ایک شخص نے بیان کیا ہے کہ میں نے اپنے اُوپر لازم کر لیا ہے کہ روزانہ آدھا گھنٹہ مطالعہ ضرور کروں گا۔ لہٰذا جب کسی دن' رات کے پونے دو بجے فارغ ہوتا ہوں تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ میں تو سوا دو بجے فارے ہوا ہوں اور اس وقت بھی میں آدھا گھنٹہ پڑھ کر سوتا ہوں۔

اُندلس کے مشہور عالم ابن رُشد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کی زندگی میں صرف دو راتیں ایسی آئیں جب وہ مطالعہ نہ کر سکے۔ ایک وہ رات جب اُن کی شادی ہوئی اور دوسری وہ جب اُن کے والد نے وفات پائی۔

ہم عورتوں کی مصروفیات کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اُن کے پیشِ نظر ہمارے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ کام چاہے تھوڑا ہی ہو مگر اس میں حضورؐ کی ارشاد کردہ مداومت ضرور پائی جائے۔

☆ **محاسبہ نفس:** حصول علم کے سلسلے میں ایک اور مفید بات جو بتائی گئی ہے وہ اپنا محاسبہ ہے۔ وہ اس طرح کہ روز یا ہفتہ وار باقاعدگی سے اپنے علم کا حساب کتاب لیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس ایک دن یا ایک ہفتے کے دوران ہمارا علم آگے بڑھا ہے یا نہیں۔ مثلاً دیکھا جائے کہ اس دوران میں.

قرآن پاک کی کچھ مزید آیات سمجھی ہیں؟

کچھ اور احادیث سے واقفیت ہوئی ہے؟

احکام دین میں سے کچھ اور احکام کا علم حاصل ہوا ہے؟

اسلامی نظام زندگی کے کسی پہلو سے تعلق رکھنے والی کوئی کتاب پڑھی ہے؟

تاریخ اسلام کا کچھ اور مطالعہ کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

☆ **جو لوگ پڑھ لکھ بھی نہیں سکتے:** آخر میں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ معاشرے میں بے شمار لوگ وہ ہیں جو معمولی نوشت وخواند سے بھی معذور ہیں۔ایسے لوگوں کے متعلق بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان پر علم کے دروازے بند ہیں۔ بے شک وہ لوگ کتابیں اور رسائل وغیرہ تو نہیں پڑھ سکتے، مگر علم والے لوگوں کے پاس بیٹھ کر اور دینی اجتماعات میں شرکت کر کے ضروری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ایک دفعہ ایک دینی بہن کو ملنے جانا تھا اور گھر کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ رہنمائی کے لیے ایک کمہار عورت کو ساتھ لیا۔ راستہ بھر اس عورت نے ایسے دینی جذبے کا اظہار کیا اور دینی مسائل پر وہ تبصرے کیے کہ سن کر حیرت ہوئی۔ پتہ یہ چلا کہ وہ اپنے محلے کے ایک دینی اجتماع میں شرکت کیا کرتی تھی اور اس صحبت نے اسے یہ سب کچھ سکھایا تھا۔

غرضکہ علم کے دروازے کسی پر بند نہیں۔ البتہ ایک طرف اسلامی معاشرے کا فرض ہے کہ اپنے اندر رہنے والے مختلف طبقات کو علم بہم پہنچانے کا بندوبست کرتا رہے اور دوسری طرف افرادِ معاشرہ کے لیے بھی ضروری ہے کہ علم کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کی تلاش میں کوتاہی نہ کریں!



اشاعتِ علم کے طریقے: ۱

تدریس

جہاں تک علم کی اشاعت کا تعلق ہے' اس معاملے میں بھی غالباً سب سے بہتر مواقع انہیں لوگوں کو حاصل ہیں جو درس گاہوں میں اسلامی علوم پڑھانے پر مامور ہیں۔ اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ اسلامیات کے مضمون میں علم دین سے تعلق رکھنے والی تقریباً سبھی ضروری چیزیں داخل ہیں۔ اب یہ پڑھانے والوں کا کام ہے کہ وہ ان تعلیمات کو پڑھنے والوں کے دلوں میں اس طرح اتار دیں کہ انہیں علم دین سے صحیح قسم کی واقفیت بھی حاصل ہو جائے اور ساتھ ہی دلوں میں یہ احساس بھی پیدا ہو جائے کہ یہ واقفیت ان کے لیے حد درجے مفید ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ماہرین تعلیم آئے دن نظامِ تعلیم اور مضامین کے نصابوں میں ردّوبدل کر کے انہیں بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ شے بہت مفید ہے مگر اصل فیصلہ کن شے پڑھانے والوں کی قابلیت' فرض شناسی اور جذبۂ خدمت ہے۔ معمولی درجے کا نصاب بھی جب قابل' فرض شناس اور جذبہ خدمت رکھنے والے استاد کے ہاتھ میں آئے گا تو وہ اسی سے بہترین نتائج پیدا کر دے گا' مگر مفید ترین نصاب بھی جب کوئی ایسا شخص پڑھائے گا جس میں نہ قابلیت ہو گی' نہ فرض شناسی' نہ جذبہ خدمت تو وہ اس کے ذریعے شاگردوں کو کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ پھر جہاں تک اسلامیات کا تعلق ہے اس کے استادوں کو تو اور بھی زیادہ دیانتدار اور فرض شناس ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ

اپنے شاگردوں کو ایک ایسا مضمون پڑھا رہے ہیں جس میں دین اور دنیا دونوں کے فوائد مضمر ہیں اور جس کی تدریس میں کوتاہی کر کے کل وہ خدا کے آگے بھی جواب دہ ہوں گے۔

یہ بات سخت تکلیف دہ ہے کہ اسلامیات پڑھانے والوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو دوسرے مضامین پڑھانے والے بعض لوگوں کی طرح، اپنے فرض کا پورا احساس نہیں رکھتے۔ بلاشبہ اُن میں بعض ایسے استاد بھی ہیں جنہیں اپنے مضمون کی اہمیت کا احساس ہے اور جو صحیح دینی جذبے کے ساتھ کام کر رہے ہیں، مگر اس مضمون کی اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ لوگ "بعض" نہ ہوتے بلکہ اسلامیات پڑھانے والے "سبھی" لوگ ایسے ہوتے جو اپنے مضمون کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کا پورا احساس رکھتے اور اس کی تدریس کا حق ادا کرنے کے لیے کوشاں رہتے۔ آخر انہوں نے یہ مضمون اپنی مرضی ہی سے چنا ہو گا، تو پھر اگر اسے چنا ہے تو اس کا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے اور اس کے انفرادی اور اجتماعی فوائد کو اور اس کی تدریس میں کوتاہی کرنے کے عذاب کو پہچاننا بھی ضروری ہے۔

اسلامیات پڑھانے والوں کو اس بات پر غور کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے مثال موقع عطا فرمایا ہے کہ وہ نئی نسلوں کو دین اسلام کا علم بہم پہنچا کر اور اسلامی اخلاق سے آراستہ کر کے ملک وملت کی صحیح اور دیرپا خدمت سرانجام دیں اور خود اپنے لیے سچی عزت اور اجر وثواب کے بے پناہ خزانے حاصل کر لیں۔ اپنے اس اصلی فریضے سے لاپروائی کر کے اگر وہ دوسری غیر اہم مصروفیات میں اپنا وقت لگائیں گے تو اُن کی حالت اُس نادان شخص کی سی ہو گی جس کے آگے موتی بکھیرے گئے ہوں مگر وہ سنگریزے چننے ہی پر اصرار کرے۔

اگرچہ سبھی مضامین سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں وہ افراد موجود ہیں جو اپنے تدریسی فرائض سے غفلت برتتے ہیں اور اپنے شاگردوں کو پڑھانے کے بجائے صرف

ٹرخاتے رہتے ہیں۔تاہم اگر اسلامیات کا کوئی استاد اس غفلت کا شکار ہو تو اس کے عملِ کی شناخت زیادہ شدت سے نمایاں ہو جاتی ہے اور شاید خدا کے نزدیک وہ قابل مواخذہ بھی زیادہ ہو' کیونکہ اس نے قرآن اور حدیث پڑھنے کے بعد فرض ناشناسی کا ثبوت دیا۔حالانکہ قرآن اور حدیث نے حلال روزی' امانت و دیانت' فرض شناسی' احساسِ ذِمّہ داری اور تبلیغ کی برکات پر جتنا زور دیا ہے اس کا علم اُسے حاصل ہو چکا تھا۔قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہے کہ اگر کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی ہدایت کا ذریعہ بنے تو جتنی نیکیاں وہ دوسرا انسان اس ہدایت کی بناء پر کرے گا' ان میں سے ہدایت دینے والے کو برابر حصہ ملتا رہے گا۔اندازہ لگایئے کہ جس انسان نے اپنی زندگی کے پچیس یا تیس (اور بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ) سال فرض شناسی کے ساتھ ہزارہا طالب علموں کو اسلامی علوم کی تعلیم دی ہو اور ان کے دین و اخلاق کو سنوارنے کی کوشش کی ہو۔اس نے اپنے لیے اجر و ثواب کے کتنے خزانے جمع کر لیے ہوں گے۔

ملک و ملت کی خدمت کا بہترین طریقہ ملک و ملت کے افراد کی سیرت سازی ہے کیونکہ کسی قوم کی اصل دولت اس کے عمدہ سیرت والے افراد ہوتے ہیں۔جن لوگوں نے اس اصل دولت کے نظریات اور اخلاق و اعمال کو درست کیا' اُن سے بڑا قومی خدمت گار اور کوئی نہیں۔کیونکہ یہ وہ معزز کام ہے جس کے لیے انبیاءؑ کو مبعوث فرمایا گیا تھا اور آدمؑ کی اولاد میں انبیاء سے زیادہ معزز اور انسانیت کا محسن اور کوئی طبقہ نہیں۔خیال کیجئے کہ اگر سیرت سازی کا یہ معزز کام خدا نے استادوں کو عطا کر رکھا ہے۔خصوصاً اُن استادوں کو جو اسلامی علوم پڑھانے پر متعین ہیں' تو کیا یہ ان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز نہیں ـــ تو پھر اگر اللہ تعالٰی نے انہیں اتنا بڑا اعزاز عطا فرمایا ہے' تو پھر وہ اُن سے یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس منصب کے شایانِ شان بنانے کی کوشش کریں اور انبیاء کی سنت کی پیروی

کرتے ہوئے انسانوں کی سیرت سازی کے کام میں کسی کوتاہی کا ارتکاب نہ کریں۔ ذیل میں اسلامی علوم پڑھانے والوں کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کی جاتی ہیں اس توقع پر کہ شاید یہ اُن کے لیے مفید ثابت ہوں۔

☆علم و فضل: اسلامیات پڑھانے والوں کی پہلی صفت یہ ہونی چاہیے کہ انہیں اپنے مضمون پر عبور حاصل ہو اور جتنے علم کی انہیں طالب علموں کو پڑھانے کے لیے ضرورت ہے اس سے بہت زیادہ علم ان کے پاس ہو۔ افسوس کہ طالب علموں کی طرح بہت سے اُستاد بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ اسلامیات بہت آسان مضمون ہے۔ اس غلط فہمی کا آغاز ایسے ہوا کہ قیام پاکستان کے بعد کافی عرصے تک دوسرے مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے رہے مگر اسلامیات کی تعلیم شروع ہی سے اُردو میں دی جاتی تھی۔ اس وقت تو واقعی دوسرے مضامین کے مقابلے میں اسلامیات کا مضمون بہت آسان تھا' کیونکہ دوسرے مضامین پڑھتے ہوئے طالب علموں کے ذہن پر ایک غیر زبان کا بوجھ بھی پڑتا تھا' جو اسلامیات کے طالب علموں کے ذہن پر نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب تو تقریباً سبھی مضامین کو اُردو میں پڑھائے جانے کا بندوبست ہو چکا ہے اور طالب علموں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو اُن مضامین کو انگریزی میں پڑھیں اور چاہیں تو اُردو میں ان کی تعلیم حاصل کریں۔ اس بندوبست کے بعد اب دوسرے مضامین اسلامیات کے مقابلے میں اتنے زیادہ مشکل نہیں رہے جتنے پہلے تھے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ اب اسلامیات دوسرے مضامین کے مقابلے میں اتنی زیادہ آسان نہیں جتنی پہلے سمجھی جاتی تھی بلکہ اسلامیات پڑھتے ہوئے تو اب بھی ایک دوسری زبان سے تعلق رکھنا ہی پڑتا ہے کیونکہ اسلامیات کے نصاب کا اچھا خاصا حصہ ہوتا ہی عربی زبان میں ہے اور اس حصے کے اصل متن ہی کو پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ طالبات اسی چکر میں اسلامیات لے لیتی ہیں کہ یہ

آسان ہے۔ پھر جب کچھ دیر پڑھ لیتی ہیں تو چلانا شروع کر دیتی ہیں کہ ہائے ہائے یہ تو بہت مشکل ہے۔ حالانکہ "بہت مشکل" وہ یقیناً نہیں، البتہ اتنی آسان بھی نہیں جتنی انہوں نے سمجھ رکھی تھی۔

اب طالبات کا اسلامیات کو آسان سمجھنا تو ایک روشن رُخ بھی رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ اسی غلط فہمی میں وہ فوج در فوج اسلامیات لے لیتی ہیں اور تھوڑا بہت دین کا علم حاصل کر لیتی ہیں مگر استادوں کا اسلامیات کو آسان سمجھنا عموماً مضر نتائج ہی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ جو اسے آسان سمجھتے ہیں وہ پھر اسباق اور لیکچروں کی تیاری پر اُس طرح محنت بھی نہیں کرتے جس طرح انہیں کرنی چاہیے اور بسا اوقات ایسے استاد اپنے طالب علموں کو صحیح طریقے سے قرآن و سنت کی تعلیم دینے اور اسلامی نظام زندگی سمجھانے کے بجائے انہیں صرف رٹا کر چلے آتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ نہ طالب علموں کے حق میں اچھا ہوتا ہے نہ ملک و ملت کے حق میں اور نہ رٹانے والوں کے اپنے حق میں۔ لہٰذا اسلامیات پڑھانے والوں کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علم کو بڑھانے کے لیے اور اس علم کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے شاگردوں کی طرف منتقل کرنے کے لیے کوشاں رہیں۔ ایم اے کر چکنے کے بعد بھی اُن کی زندگی میں اپنے مضمون کے مطالعے کا ایک مستقل مقام ہونا چاہیے' ورنہ وہ تدریس کا حق ادا نہیں کر سکیں گے اور پڑھا پڑھایا بھی بھول جائیں گے۔

عون بن عبداللہ کا مقولہ ہے۔ "تقویٰ کا کمال یہ ہے کہ نیا علم حاصل کرتے رہو۔ یہ علم پر ظلم ہے کہ اس میں اضافے کا خیال نہ ہو۔ علم بڑھانے سے غفلت برتنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اپنے موجودہ علم سے فائدہ نہیں اُٹھا رہا ہے۔"

مشہور عالم اصمعی سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ سب علم کیونکر محفوظ رکھا۔ جبکہ آپ کے ساتھی بھول گئے۔ وہ کہنے لگے کہ میرے ساتھیوں نے علم حاصل کرنے کے بعد

اُسے چھوڑ دیا تھا' مگر میں برابر چرچا کرتا رہا۔

ایم اے کا مطلب یہ بتایا جاتا ہے کہ جس مضمون میں ایم اے کر لیا جائے' اُس کا انسان ماسٹر ہو گیا یعنی اس پر اُسے پورا عبور حاصل ہو گیا۔ حالانکہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایم اے کر چکنے کے بعد بھی ابھی ہم اپنے مضمون کے ماسٹر ہونے سے بہت دُور ہوتے ہیں۔ خصوصاً جن لوگوں نے ایم اے کر چکنے کے بعد تدریس کا فریضہ سرانجام دینا ہو' انہیں تو اس بات کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ جس مضمون میں ایم اے کر چکے ہیں۔ اس کا پورا سنجیدگی سے مطالعہ جاری رکھیں۔ امام زہری فرماتے ہیں:

"علم کے میدان بہت سے ہیں' تو جس میدان میں بھی اُترے گا چلتے چلتے تھک جائے گا اور علم ختم نہ ہوگا۔"

تاہم ان میدانوں میں وہاں تک جانا ضروری ہے جہاں تک جایا جا سکے۔
اسلامیات پڑھانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ انہیں عربی زبان ایک حد تک ضرور آتی ہوتا کہ قرآن و حدیث اور فقہ وغیرہ پڑھاتے ہوئے وہ صرف ترجموں پر انحصار کرنے کی کمزوری سے محفوظ رہیں اور اعتماد کے ساتھ اصل متن کو قابلیت سے پڑھا سکیں۔ عربی زبان جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلامیات کے نصاب میں عربی گرامر کا کچھ حصہ لازماً ہوتا ہے اور اسے رٹ رٹا کر پڑھا دینے سے پڑھانے کا حق ادا نہیں ہوتا۔

اسلامیات پڑھانے والوں کو اپنے تلفظ کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہوگی کہ ایک استاد قرآن پڑھائے مگر غلط تلفظ میں پڑھائے۔ بسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ جن بچیوں نے گھر میں صحیح تلفظ سیکھا ہوتا ہے وہ استادوں کی تلفظ کی غلطیاں محسوس کر لیتی ہیں اور اگر وہ لحاظ کے باعث منہ سے نہ بھی بولیں تو بھی ایسے اُستادوں کی علمیت پر انہیں زیادہ بھروسہ نہیں رہتا۔

اسلامیات پڑھانے والوں کو اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ پر بھی ایک حد تک عبور ضرور حاصل ہونا چاہیے تا کہ تدریس کے دوران وہ مفید تاریخی حوالے دے سکیں اور یہ حوالے درست ہوں۔ ایک بڑا ہی افسوسناک واقعہ پیش آیا جو آج تک ذہن میں تازہ ہے۔ ایک اسلامیات کی استاد جنہیں تدریس کا کام کرتے کئی سال ہو چکے تھے اور اس دوران میں انہوں نے اپنے شاگردوں کو عباسی عہد ضرور پڑھایا ہوگا' اپنی ایک ساتھی سے پوچھ رہی تھیں کہ کیا برامکہ بنوامیہ کے وزراء تھے۔ تاریخ اسلام سے ذرا سا مس رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ سوال علمیت کی کس سطح کا پتہ دے رہا ہے۔ اسلامیات کے کسی استاد کا برامکہ کے متعلق یہ پوچھنا کہ کیا وہ بنوامیہ کے وزراء تھے' ایسے ہی ہے جیسے آج کل کا کوئی پڑھا لکھا انسان یہ سوال کرے کہ کیا جمی کارٹر روس کا صدر ہے؟

جیسے کہ بیان کیا جا چکا ہے' اس قسم کی کوتاہیاں صرف اسلامیات کے استادوں ہی سے سرزد نہیں ہوتیں بلکہ دوسرے مضامین میں بھی ایسے "عالم" موجود ہیں جن کی علمی سطح دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ وہ تدریس کے منصب پر فائز کیسے ہو گئے۔ مثلاً ایک فلسفے کی ایم اے خاتون جنہیں ملازمت میں آئے ہوئے بھی چند سال ہو چکے تھے' ڈارون پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نہایت اعتماد سے فرما رہی تھیں کہ ڈارون دو ہزار سال قبل مسیح کا آدمی تھا۔ تاہم اسلامیات پڑھانے والی خاتون کا برامکہ کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ کیا وہ بنوامیہ کے وزراء تھے' زیادہ پریشان کن ہے۔ اس لیے کہ اگر اپنے مضمون کے حصہ تاریخ کے بارے میں ان کی معلومات کا یہ عالم ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حصہ قرآن وحدیث کے معاملے میں ان کی علمیت کا پایہ زیادہ بلند ہوگا۔

ایسے ہی اسلامیات پڑھانے والوں کو دین اسلام اور اسلامی نظامِ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں عام معلومات کما حقہ' حاصل ہونی چاہئیں تا کہ وہ اپنے

طالب علموں کو اسلام کے ایک مکمل نظام زندگی ہونے کا جامع تصور دلا سکیں اور اگر انہیں ان مسائل پر کہیں گفتگو کرنی پڑے تو سہولت اور اعتماد سے بول سکیں۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ اپنے لڑکوں سے فرمایا کرتے تھے کہ "آؤ مجھ سے علم حاصل کرو کیونکہ عنقریب تم قوم میں بڑے آدمی ہو گے۔ میں بھی پہلے چھوٹا تھا اور کوئی میری پروا نہیں کرتا تھا' لیکن جب جوان ہوا تو لوگ دوڑ دوڑ کر آنے اور میرے فتوے لینے لگے۔ اس سے بڑھ کر عیب اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدمی سے اُس کے دین کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ جاہل نکلے۔"

مثال کے طور پر آج کل انسان کا معاشی مسئلہ گفتگو اور تحقیق کا بہت بڑا موضوع بنا ہوا ہے۔ اسلامیات پڑھانے والوں کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کی معاش کے بارے میں اسلامی اصول کیا ہیں اور وہ جدید معاشی نظریات کے معاملے میں انسان کے لیے کتنے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے ہی اسلام کے سیاسی نظریات معاشرتی اصول اور اسلامی نظام زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں کما حقہ' علم حاصل ہونا چاہیے تاکہ ایک طرف طالب علموں کی حق ادائی ہو اور دوسری طرف خدمت دین اور اشاعتِ علم دین کا فریضہ بھی سر انجام پایا جاتا رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامیات پڑھانے والوں کے نمایاں اوصاف میں ایک وصف یہ ضرور ہونا چاہیے کہ اُن میں

☆ **جذبہ تبلیغ:** موجود ہو تاکہ وہ طلبہ اور طالبات کو صرف علم دین سکھائیں ہی نہیں بلکہ انہیں اس پر عمل پیرا کرانے کی بھی امکانی کوشش کرتے رہیں۔ کیونکہ دینی علوم سیکھنے کا اصل مقصد یہی ہے۔ اگر علوم اسلامیہ کی طالبات قرآن پڑھتے ہوئے تلفظ کی فاش غلطیاں کریں' کمرہِ امتحان میں بیٹھ کر نقلیں ماریں' حیا اور بے حیائی میں کچھ فرق نہ کر سکیں اور اپنے پہننے اوڑھنے کے انداز اور زندگی کے عام طور طریقوں میں خلافِ اسلام طرز عمل اختیار کریں تو یہ دراصل اسلامیات پڑھانے والیوں کی ناکامی کی دلیل ہے۔

پھر جذبہِ تبلیغ ہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ استادوں کی تبلیغ صرف طالب علموں ہی کے لیے نہ ہو بلکہ اپنے آپ کے لیے بھی ہو۔ اسلامیات پڑھانے والیوں کی اپنی زندگی اگر اسلام کے اصولوں سے ٹکراتی ہوگی تو اس سے نہ صرف یہ کہ اُن کی زبان میں کوئی تاثیر نہیں رہے گی بلکہ اسلامیات کی طالبات کے دلوں میں ان کے لیے کوئی حقیقی عزت وقدر بھی نہیں ہوگی اور اگر استاد کے لیے دل میں عزت نہ ہوگی تو اس کے درس وتدریس کو دھیان سے سنا بھی نہیں جائے گا۔ تجربے نے بتایا کہ اسلامیات کی طالبات خود جیسی کیسی بھی ہوں' اپنے استادوں سے وہ یہی توقع رکھتی ہیں کہ وہ اسلام کے اصولوں پر عمل کرنے والی ہوں۔ ایک اسلامیات کی لڑکی جو خود بھی ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنے کی کچھ ایسی عادی نہیں تھی' اپنی اسلامیات کی ایک استاد کے بارے میں سخت رنج وغم اور دل شکستگی کا اظہار کرتے سنی گئی کیونکہ اس استاد کو وہ سڑکوں پر ننگے سر پھرتے دیکھا کرتی تھی۔

پھر جذبہ تبلیغ ہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ کوشش کی جائے کہ درسگاہوں میں زیادہ سے زیادہ طالب علم اس مضمون کو لیں تا کہ انہیں غیر ارادی طور پر ہی سہی مگر احکامِ دین کے ایک حصے سے واقفیت تو ہو جائے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ اس مضمون میں طالبات کی تعداد بہت زیادہ ہونے کے باعث بعض استاد خواتین گھبرا جاتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ طالبات کم ہوں۔ کیونکہ جب مجمع زیادہ ہو تو پڑھاتے ہوئے آواز زیادہ بلند رکھنی پڑتی ہے اور اعصاب پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔ پھر امتحانات میں پرچے دیکھنے کا کام بھی اسلامیات پڑھانے والوں کا بہت زیادہ ہوتا ہے' بہ نسبت ان استادوں کے کام کے جن کی کلاسوں میں طالبات کم ہوتی ہیں۔ چنانچہ قدرتی بات ہے کہ آسانی پسند لوگ یہی چاہیں کہ طالبات کم ہوں' مگر اسلامیات پڑھانے والوں کے لیے یہ سخت افسوس کا مقام ہے کہ وہ طالبات کی زیادتی سے گھبرائیں' ذرا سوچیے کہ آخر آپ اُنہیں لوگوں کی جانشین ہیں جن کے سامنے ہزاروں کی

تعداد میں طلبہ بیٹھے ہوتے تھے۔ اگر آپ کو کام زیادہ کرنا پڑتا ہے تو خیر کو پھیلانے میں آپ کا حصہ بھی تو اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے۔

پھر جذبہ تبلیغ ہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ درسگاہ کی جو طالبات اسلامیات نہیں لیتیں ان تک بھی دینی معلومات پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں اور بعض درسگاہوں میں کیے بھی جارہے ہیں۔ ان طریقوں میں ایک یہ ہے کہ درسگاہ میں قرآن وحدیث کے درس کا انتظام قائم کیا جائے جن میں ان طالبات کو خاص طور پر آنے کی دعوت دی جائے جو اسلامی علوم نہیں پڑھتیں۔ ایسے ہی درسگاہوں میں عموماً مختلف مضامین کی اپنی اپنی سوسائٹیاں بنی ہوتی ہیں۔ لہٰذا اسلامیات سوسائٹی کے زیرِ نگرانی وقتاً فوقتاً ایسے لیکچر کرانے کا بندوبست کرتے رہنا چاہیے جن میں دین کے اصولوں اور اسلامی نظامِ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں مفید معلومات ہوں۔ اس کے علاوہ دینی موضوعات پر تقاریر کے مقابلے کرانے اور انعامی مضامین لکھوانے سے بھی طالبات میں اسلامی علوم کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

پھر جذبہ تبلیغ ہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ درس گاہ کے دوسرے استادوں تک بھی دین کا علم پہنچانے کی امکان بھر کوشش جاری رکھی جائے۔ قیام پاکستان کے بعد جو مفید کام ہوئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ مختلف مضامین کے اپنے اپنے نصاب میں ان مضامین سے تعلق رکھنے والے اسلامی نظریات کا مطالعہ رکھ دیا گیا ہے مثلاً معاشیات میں اسلام کے معاشی نظریات کو سمجھنا ہوگا۔ سیاسیات میں اسلام کے سیاسی نظریات کو' وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ علومِ اسلامیہ پڑھانے والوں کو ان نظریات سے زیادہ واقفیت ہوتی ہے (یا ہونی چاہیے) لہٰذا اگر وہ ان مضامین کو پڑھانے والیوں کو ان کے نصاب کے اسلامی نظریات سے تعلق رکھنے والے حصوں کے لیے مفید کتب بتا دیا کریں یا ان کی تدریس میں کچھ امداد

دے دیا کریں یا زبانی گفتگو ہی کے ذریعے مفید معلومات بہم پہنچا دیا کریں تو اس سے جہاں ایک طرف اپنے ساتھ کام کرنے والی بہنوں کی امداد کا حق ادا ہو گا وہاں دوسری طرف تبلیغ دین کے سلسلے میں بھی مفید کام ہو جایا کرے گا۔

یہ تو چند تجاویز ہیں اور بعض درسگاہوں میں ایک حد تک یہ کام ہو بھی رہے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ان میں روح پیدا کی جائے تا کہ اگر درس دیا جا رہا ہے یا لیکچر کروائے جا رہے ہیں تو حاضری زیادہ سے زیادہ ہو تا کہ زیادہ لوگوں تک بات پہنچے اور زیادہ لوگ متاثر ہوں۔ ایسے ہی اگر آپ کسی دوسرے مضمون والے کو اس کے نصاب کے اسلام سے تعلق رکھنے والے حصوں کے بارے میں کچھ بتائیں یا کتابیں بہم پہنچائیں تو انہیں آپ کی قابلیت اور آپ کے انتخاب پر پورا بھروسہ ہو۔ اب یہ روح کیسے پیدا کی جائے؟---اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دلوں کے اندر خدمتِ دین کا شدید جذبہ موجود ہو۔

ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ تبلیغ دوسروں کو خدا کا پیغام پہنچانے کا نام ہے اور دوسرے آپ کی بات تبھی سنیں گے جب اُن کے آپ سے تعلقات درست ہوں گے۔ لہٰذا جس نے تبلیغ کرنی ہے اس کے لیے تیز مزاج، زود رنج اور غصیلا ہونے کی گنجائش نہیں۔ ان ذریعوں سے شاید کوئی ذاتی مفاد تو حاصل کر لے (اگرچہ اس کا امکان بھی کم ہے) لیکن جہاں تک دین کو پھیلانے کا تعلق ہے۔ تبلیغ کرنے والے کا تیز مزاج اور غصیلا ہونا دین کے مخالف تو پیدا کر سکتا ہے مگر حامی پیدا کرنا بے انتہا مشکل ہے۔

ایسے ہی علوم اسلامیہ پڑھانے والوں میں جو اوصاف لازماً ہونے چاہئیں ان میں ایک

☆ **دیانت اور فرض شناسی:** ہے۔ علومِ اسلامیہ پڑھانے والوں کا اصل مقصد تو خدا کی خوشنودی اور علم دین کی اشاعت ہونا چاہیے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ انہیں ان کے

کام کے عوض تنخواہ دی جاتی ہے۔ ان کی دیانت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس تنخواہ کو پوری طرح حلال کر کے لیں۔ ایسے نہ ہو کہ وہ تنخواہ تو لے لیا کریں مگر جس کام کا یہ عوض ہے اُسے کرنے میں کوتاہی کرتے رہیں۔ ورنہ جس تناسب سے وہ اپنے کام میں کوتاہی کریں گے اسی تناسب سے ان کی تنخواہ کا ایک حصہ حرام ہوتا جائے گا۔ اس بات کو وضاحت سے ذہن نشین کرنے کے لیے یوں اندازہ کر لیجئے کہ اگر کسی استاد کا فرض منصبی یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ روزانہ تین گھنٹے پڑھائے اور اس کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روزانہ ایک گھنٹہ پڑھانے کے عوض حکومت یا اس درسگاہ کو چلانے والی انجمن اُسے کم و بیش سترہ روپے دے رہی ہے۔ اب جس دن بھی وہ کوئی گھنٹہ لاپرواِئی کی نذر کر دے گا اور بغیر کسی جائز عذر کے کلاس نہیں لے گا' اُس دن اس کی تنخواہ میں سے کم و بیش سترہ روپے حرام ہو جائیں گے۔ اب اندازہ لگائیے کہ جو لوگ آئے دن یہ حرکت کرتے رہتے ہیں اور بے وجہ کلاسیں چھوڑ دیتے ہیں' مگر مہینہ گزرنے پر تنخواہ پوری وصول کر لیتے ہیں' ان کی آمدنی میں حلال کتنی ہوگی اور حرام کتنی۔ ایسے ہی طالب علموں کو پورا وقت نہ دینا بھی دیانت کے خلاف ہے۔ اگر ایک استاد گھنٹی ہونے کے پندرہ منٹ بعد کلاس میں پہنچتا ہے اور دس منٹ پہلے کلاس چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح پچیس منٹ ضائع کر دیتا ہے۔ اس نے گویا اس وقت کی چوری کی جو اسے طالب علموں کو پڑھانے پر صرف کرنا چاہیے تھا۔

دیانت اور فرض شناسی ہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ طالب علموں کو ٹرخایا نہ جائے' اور جو سبق پڑھانا ہو یا جو لیکچر دینا ہو' اس کے بارے میں اچھی طرح مطالعہ کر کے اور اسے پوری طرح تیار کر کے طالب علموں کا سامنا کیا جائے۔ ہر مضمون میں تحقیق کا کام جاری ہے اور نئے نئے حقائق دریافت ہو رہے ہیں۔ جو استاد اپنے مضمون کا مطالعہ ہی نہیں کرے گا' اس کا علم باسی ہو جائے گا اور جو تیاری کیے بغیر طالب علموں کے سامنے جا کھڑا ہوگا وہ تدریس کا

حق ادا نہیں کر سکے گا۔ پھر اسلامیات میں تو قرآن اور حدیث سے بھی تعلق ہوتا ہے' لہٰذا اور بھی زیادہ احتیاط اور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ انسان نادانستہ طور پر کوئی غلط بات کر کے اُلٹا عذاب کا مستحق نہ ہو جائے اور معین وقت میں اس نے جتنا علم دین طالب علموں کو بہم پہنچانا تھا اس میں کمی واقع نہ ہو۔ مسلسل مطالعے اور تیاری ہی سے انسان اس قابل رہتا ہے کہ طالب علموں کے سوالات کا اعتماد سے جواب دے سکے۔

بعض استاد یہ سمجھتے ہیں کہ شاگردوں کو آسانی سے ٹرخایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے بعض صورتوں میں کسی حد تک ایسا ہو جاتا ہو' مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ استادوں کے سب سے زیادہ تیز دماغ نقاد بھی اُن کے شاگرد ہی ہوتے ہیں۔ استادوں کے لیے کچھ دیر تک شاگردوں کو ٹرخاتے رہنا تو شاید آسان ہو' مگر شاگردوں کے دلوں میں یہ احساس نہ پیدا ہونے دینا کہ ہمیں ٹرخایا جا رہا ہے' ہرگز آسان کام نہیں' جو استاد شاگردوں کو ٹرخاتے ہیں وہ چاہے اپنے منہ سے اپنی فرض شناسی کا کتنا ہی اعلان کیوں نہ کرتے رہیں' انجام کار وہ اپنے علمی ماحول میں ''ٹرخانے والے استاد'' کی حیثیت سے مشہور ہو کر رہتے ہیں اور اس طرح انسان فرض ناشناسی سے کام لے کر **خزی فی الدنیا** اور **عذاب الاخرة** دونوں کا شکار ہونے کے خطرے میں مبتلا رہتا ہے۔

پھر فرض شناسی ہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ درس گاہ کے نظم کی پابندی کی جائے' ہر اُستاد کا فرض ہے کہ اگر اس نے چھٹی کرنی ہے تو درس گاہ میں چھٹی کے لیے عرضی بھیجے اور بغیر عرضی بھیجے اپنی مرضی سے چھٹی منا کر نہ بیٹھ جائے۔ کیونکہ درس گاہوں کے ضابطہ اخلاق میں عرضی دیے بغیر چھٹی منا کر بیٹھ جانا جرم سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی ہر درس گاہ میں کام کو نظم وضبط سے چلانے کے لیے ایک معین ٹائم ٹیبل ہوتا ہے جس کی پابندی کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہر اُستاد اپنی مرضی سے جب چاہے اپنی کلاسیں لینا شروع کر دے تو

تدریس کا کام تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ کئی کئی دن کلاسیں نہیں لیں گے اور پھر کچھ دن معمول سے زیادہ لے کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنے دل کو مطمئن کر لیں گے کہ ہم نے کام تو پورا کر دیا ہے۔ اس طرح درسگاہ کے نظم کو توڑ کر دل کو جو تسلی دی جاتی ہے وہ قطعی جھوٹی ہوتی ہے کیونکہ کچھ دن نہ پڑھانا اور چند دن بہت زیادہ پڑھا دینا طالبات کے لیے چنداں مفید بھی نہیں ہوتا اور ان کے لیے بہت کچھ پریشانی کا باعث بھی بنتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ انسان ایک دوسرے سے اچھائی سیکھے یا نہ سیکھے برائی بہت جلد سیکھتا ہے' جو لوگ اس طرح کچھ دن کام نہیں کرتے اور پھر زیادہ کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں' اُن کی دیکھا دیکھی جو لوگ اپنے کام میں سستی کرنا شروع کر دیتے ہیں' وہ سبھی ایسے نہیں ہوتے کہ بعد میں زیادہ کام کر کے کمی کو پورا کر دیں۔ لہٰذا اپنے کام کو بدنظمی سے کرنے والے غیر ارادی طور پر دوسروں کو کام سے جی چرانے اور فرض سے منہ موڑنے کا سبق پڑھانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

یہ گزارشات تو ان بہنوں کے لئے ہیں جنہیں درسگاہوں میں کام کرنے کے مواقع حاصل ہیں' مگر ان کی تعداد تو باقی عورتوں کے مقابلے میں تھوڑی ہوتی ہے۔ اکثریت تو انہیں کی ہے جنہیں یہ مواقع حاصل نہیں۔ لہٰذا اُن میں اگر بعض اشاعتِ علم دین کا کام کرنا چاہیں تو انہیں کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں؟

اشاعت علم کے طریقے:۲

ہفتہ وار دینی اجتماعات

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں اسلام دوست خواتین اور بچیوں نے ہفتہ وار دینی اجتماعات کا نظام قائم کر رکھا ہے اور خدا کی مہربانی سے اس کے اثرات بہت خوشگوار ہیں، مگر ملک کی آبادی کے پیش نظر یہ حلقے بہت کم ہیں اور ضرورت ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ جن اسلام دوست خواتین کے لیے درسگاہوں میں تدریس ممکن نہ ہو، مگر ان میں اتنی قابلیت موجود ہو کہ قرآن و حدیث کا درس دے سکیں۔ انہیں چاہیے کہ ان حلقوں کو بڑھانے کی کوشش کریں اور ہفتہ وار اجتماعات کے ذریعے عوام تک علم دین پہنچائیں، دردمند خواتین کو ایک طرف تو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ علاقوں اور آبادیوں میں ہفتہ وار اجتماعات کیے جایا کریں اور دوسری طرف ایسے طریقے بھی سوچنے چاہئیں جن سے ان کی حاضری بڑھے اور عورتوں کو ان میں شرکت کرنے کا شوق پیدا ہو۔

اجتماعات کا اصل مقصد تو خدا اور خدا کے رسولؐ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ لہٰذا حاضری جتنی کم ہوگی اتنا ہی یہ پیغام کم پہنچے گا اور جتنی زیادہ ہوگی اتنا زیادہ پہنچے گا۔ لہٰذا صرف اجتماع کر لینا ہی کافی نہیں، یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ اس میں شرکت کرنے والی خواتین دن بدن بڑھتی جائیں تا کہ درس دینے والی خواتین کے اثرات زیادہ سے زیادہ دُور تک پھیلیں۔ اس کے لیے ہر کام کرنے والی خاتون کو اپنے مخصوص ماحول کے پیش نظر مناسب

تجاویز سوچنی چاہئیں۔ ہاں چند امور ایسے ہیں جن پر غور کر لینا سبھی کے لیے مفید ہوگا۔

گھروں میں کاموں کی مصروفیت اپنی جگہ بالکل درست عذر ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جن کاموں کا خواتین کو شوق پیدا ہو جائے اُن کے لیے وہ وقت نکال ہی لیتی ہیں۔ لہٰذا پہلا کام یہ ہے کہ ان کے دلوں میں علم کا شوق پیدا ہو اور یہ شوق پیدا کرنے کے لیے اُنہیں بار بار' موقع موقع سے وہ آیات' احادیث اور بیانات وغیرہ سناتے رہنا چاہیے جن میں علم کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور ان واقعات کو ان کے سامنے دہرانا چاہیے جنہیں سن کر مسلمانوں کے شوقِ علم کا اندازہ ہو۔ کتاب کے شروع میں مسلمانوں کے شوقِ علم کے جو قصے بیان ہوئے ہیں وہ اسی مقصد کے لیے بیان کیے گئے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں میں بھی یہ شوق سر اُٹھائے اور اُن کے لیے علم حاصل کرنے کی راہیں آسان کرے۔ کیونکہ شوق راہ کی مشقتوں کو آسان کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ درس دینے والی خاتون کو اس بات کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے کہ اجتماعات میں شامل ہونے والی عورتوں کے ساتھ رویہ ہمدردانہ' دوستانہ اور غمگسارانہ ہو۔ انسان عموماً اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے مسائل میں دلچسپی لی جائے اور اُن کا حل بتایا جائے اور مسائل تو انسانوں کو گھیرے ہی رہتے ہیں۔ کہیں کوئی بیماری وجہ پریشانی ہوگی' کہیں بے روزگاری نے زندگی اجیرن کر رکھی ہوگی کہیں اولاد کی بے راہروی اور نافرمانی وجہ عذاب ہوگی' کہیں خاوند کی بدسلوکی اور بدمزاجی نے جینا حرام کر رکھا ہوگا۔ کئی ایسی نادان بھی ہوں گی کہ خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑا کر جان کو الجھنوں میں پھنسا رکھا ہوگا اور کئی ایسی دانا بھی ہوں گی' جنہیں ملک وملت کے مصائب کے احساس نے دُکھی کر رکھا ہو گا۔ انسانی دُکھوں کی کوئی ایک قسم تو ہے نہیں۔ یہ تو اَن گنت اور بے شمار ہیں اور جس انسان کو جو دُکھ بھی ستا رہا ہوتا ہے' اُس کے خیال میں وہی سب سے بڑا دکھ ہوا ہے۔ اگر درس دینے

والی خواتین درس میں شامل ہونے والی عورتوں کے ان انفرادی دکھوں سے واقف رہنے کی کوشش کریں اور اپنے درس کے دوران قرآن وحدیث کی روشنی میں ان دُکھوں کی وجوہ اور ان کے حل پر تبصرہ کرتی رہیں تو اس سے خواتین کو درس میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوگی اور ان کے ذہن میں یہ حقیقت بھی نقش ہوگی کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس سے آخرت کا اجروثواب ہی نہیں بلکہ دنیا کا امن وسکون بھی حاصل ہوتا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ان اجتماعات میں ناغہ نہ ہونے دیا جائے۔ چونکہ انسان کے ساتھ دکھ بیماری اور بعض ناگزیر مصروفیات لگی ہوئی ہیں' اس بات کا بندوبست ہونا چاہیے کہ جس دن اصل خاتون درس نہ دے سکیں اُس دن کوئی اور خاتون کچھ سنا دے مگر ناغہ نہ ہو۔ کیونکہ ناغہ اجتماعات کی حاضری پر برا اثر ڈالتا ہے۔ اجتماعات میں شرکت کرنے والی خواتین میں ایک جماعت تو باقاعدگی سے آنے والی ہوتی ہے اور بعض خواتین ناغے کرکے آتی ہیں۔ اب اگر دونوں قسم کی خواتین کو اچھی طرح معلوم ہو کہ اجتماع ضرور ہوگا تو جو باقاعدگی سے نہیں بھی آتیں اُنہیں بھی جس دن فرصت ہوگی آجائیں گی اور اس حیص بیص میں نہیں پڑیں گی کہ خدا معلوم آج اجتماع ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس اگر اجتماع میں ناغے ہوں گے تو باقاعدگی سے آنے والی بھی دل شکستہ ہوکر بے قاعدگی کی طرف مائل ہوجائیں گی اور جو پہلے ہی بے قاعدہ تھیں وہ اور زیادہ سست ہوجائیں گی اور عجب نہیں کہ بالکل ہی آنا چھوڑ دیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تدریس کے کام کی طرح یہاں بھی اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ درس دینے والی خواتین اپنے علم وفضل کو بڑھانے کے لیے کوشاں رہیں اور قرآن وحدیث کے علاوہ دین سے تعلق رکھنے والے دوسرے لٹریچر کا بھی مطالعہ کرتی رہیں تاکہ اپنے درس کو زیادہ سے زیادہ پراثر بنا سکیں۔ درس دینے والی خاتون کا اسلام اور اسلام کے نظام زندگی کے بارے میں جتنا علم زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ زیادہ اچھے طریقے سے درس

دیں گی۔ خواتین عموماً خشک وعظ سے جلدی گھبرا جاتی ہیں اور انہیں نیند آنی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر درس دینے والی خاتون کی معلومات زیادہ ہوں گی اور وہ اس قابل ہوں گی کہ موقع موقع سے احادیث' سلف صالحین کے فرامین' تاریخی واقعات' حکیمانہ مقولوں اور دلچسپ بیانات سے کام لیتی رہیں تو اُن کا درس خواتین کے لیے پر کشش رہے گا اور سننے والوں کی دلچسپی اور توجہ قائم رہے گی۔ اس سے ان میں خواہش پیدا ہو گی کہ آئندہ بھی شامل ہوں۔

اجتماعات کے ناکام ہونے میں جہاں ایک طرف شامل ہونے والی خواتین کی علمی اور دینی بے حسی کا دخل ہوتا ہے وہاں دوسری طرف یہ وجہ بھی موجود ہوتی ہے کہ حلقہ چلانے والی خاتون اپنی بات کو اتنا مؤثر نہیں بنا سکی ہوتیں کہ سننے والوں کو زیادہ سننے کی خواہش پیدا ہو۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ لوگ قرآن وحدیث کے احکامات کا اثر لیں اور اثر لینے والے زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اس لیے اجتماع کا نظام شروع کر کے لاپروا نہیں ہو جانا چاہیے کہ چلو اب معاملہ چل ہی رہا ہے بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہنی چاہیے اور کوشش ہونی چاہیے کہ درس دن بدن بہتر سے بہتر طریقے سے دیا جائے اور سننے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے۔

☆ **ناظرہ قرآن:** ماضی قریب ہی کا معاملہ ہے اور بعض گھرانوں میں یہ مبارک رسم اب بھی جاری ہے کہ شریف گھرانوں کی عورتیں گلی محلے کے بچوں کو لِلّٰہ کلام پاک پڑھا دیا کرتی تھیں۔ جن جن گھرانوں کی خواتین کے حالات اجازت دیں' وہاں یہ مبارک رسم جاری کرنی چاہیے بلکہ اس کا رواج عام کرنا چاہیے۔ البتہ پرانے نظام میں اتنی ترمیم کر لی جائے کہ بچوں کے علاوہ بڑی عمر کی عورتیں بھی اگر خواہشمند ہوں تو انہیں پڑھایا جائے۔ ظاہر ہے ان بچوں اور عورتوں کے لیے ترجمہ اور تفسیر پڑھنا اور یاد رکھنا بہت مشکل ہو گا۔ اس لیے اتنا کافی ہو گا کہ انہیں ناظرہ قرآن پڑھاتے ہوئے ساتھ ساتھ عام سادے الفاظ میں

یہ بتا دیا جایا کرے کہ دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے اور یہاں یہ حکم دیا ہے۔ اس طریقے سے ان کے دلوں میں یہ بات راسخ کی جائے کہ قرآن ثواب کے لیے بھی پڑھا جاتا ہے اور اس لیے بھی پڑھا جاتا ہے کہ اس سے خدا کے احکام معلوم ہوں اور جب احکام معلوم ہوں تو پھر ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح انہیں ناظرہ قرآن پڑھاتے ہوئے ساتھ قرآن کے اوامر اور نواہی یاد کرائے جاتے رہیں اور وقتاً فوقتاً ذہن نشین کرایا جاتا رہے کہ دیکھو اب تمہیں خدا تعالیٰ کے اتنے احکام یاد ہو گئے ہیں اور اب اتنے یاد ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھار سوال بھی کر لیا جائے کہ بتاؤ اب تک تم نے قرآن پاک سے خدا تعالیٰ کے کتنے اور کون کون سے احکام یاد کیے ہیں۔ اس طرح بچوں اور عورتوں کو ناظرہ قرآن پڑھتے ہوئے آسانی سے قرآن کے بہت سے احکام بھی یاد ہو جائیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس طرح ناظرہ قرآن پڑھانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ پڑھانے والی خاتون کو خود ترجمے اور تفسیر پر نگاہ حاصل ہو۔

☆ترجمہ اور تفسیر کی کلاسیں: اس کے علاوہ خواتین میں سے پڑھی لکھی اور قرآن وحدیث کو جاننے والی بیبیوں میں سے جن کے حالات اجازت دیں، وہ اگر اپنے گھروں میں تعلیم یافتہ خواتین کے لیے قرآن کے ترجمہ وتفسیر کی کلاس شروع کر سکیں تو انشاء اللہ تعالیٰ یہ بہت مفید ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ بعض اسلام دوست بہنوں نے یہ مبارک عمل شروع کر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے گھروں میں واقف کار تعلیم یافتہ خواتین کے لیے ترجمہ وتفسیر کی چھوٹی موٹی درسگاہیں قائم کر کے انہیں قرآن سے واقف کرانے کی کوشش کی ہے اور نتائج بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس کام کے لیے وہی وقت مناسب ہے جب گھر کے مرد اور بچے باہر ہوں اور گھر دار خواتین کو کچھ یکسوئی حاصل ہو۔

☆اولاد سے محروم خواتین: دیکھا گیا ہے کہ بعض خواتین جنہیں خدا نے اولاد نہیں

عطا کی ہوتی' اس لیے اُن کے پاس نسبتاً زیادہ فرصت ہوتی ہے۔ اپنی اس فرصت سے بھی گھبرا جاتی ہیں اور جو چیز انہیں خدا نے نہیں دی ہوتی اُسے لوگوں سے مانگ مانگ کر اپناتی ہیں۔ اب اگر تو اس طرح لیے جانے والے بچے یتیم ہوں اور انہیں پالنے والے موجود نہ ہوں یا وہ بہت زیادہ غریب اور تنگ دست گھرانوں سے تعلق رکھتے ہوں تو پھر تو یہ عمل مفید اور باعثِ ثواب ہے کیونکہ یتیم اور غریب کی کفالت کرنا بہت اجر کا باعث ہے لیکن اگر اُن کے والدین نہ صرف زندہ ہوں بلکہ انہیں اچھی طرح پال بھی سکتے ہوں تو پھر یہ عمل چنداں مفید معلوم نہیں ہوتا' کیونکہ لے کر پالے جانے والے بچے اگر ایک طرف لینے والوں کو خوشی بہم پہنچاتے ہیں تو دوسری طرف اُن کے لیے بہت کچھ پریشانی کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔

پہلی بات تو یہی ہے کہ دوسروں کے بچے لے کر پالنے والے عموماً ہمہ وقت اس بے چینی میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں لوگوں کو پتہ نہ چل جائے کہ یہ بچے ہمارے اپنے نہیں' خود بچوں کے بارے میں بھی انہیں کھٹکا لگا رہتا ہے کہ انہیں معلوم نہ ہو جائے کہ ہم ان کے اصلی والدین نہیں ہیں۔ پھر بعض اوقات اصلی والدین کسی سٹیج پر اپنے بچے واپس لینے کا مطالبہ بھی کر دیتے ہیں جس سے پالنے والوں کو سخت رنج وغم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے والدین بھی ہوتے ہیں جو بچے واپس تو نہیں لیتے مگر پالنے والوں پر اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ یہ ہمارے بچوں کو بگاڑ رہے ہیں اور یہ اعتراض ہمیشہ غلط بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ لے کر پالنے والے والدین عموماً اپنے لے پالکوں کے بارے میں وہ نارمل طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتے جو اصلی والدین غیر ارادی طور پر اختیار کیے رہتے ہیں' اس لیے ایسے بچوں کے بگڑ جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ یہی بچے اگر اپنے اصلی والدین کے پاس بہن بھائیوں میں پلتے تو وہ زندگی گزارنے کے بہتر ڈھنگ سیکھتے۔ غرضکہ پرائی اولاد اگر کچھ خوشی دیتی ہے تو بہت کچھ خدشوں' خطروں اور غیر محفوظ ہونے کے احساس میں بھی مبتلا رکھتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اولاد سے محروم ہیں وہ دوسروں کے بچے لے کر نہ پالیں، جس چیز کو خدا نے جائز رکھا ہے اسے ناجائز سمجھنے کا کیا سوال ہے۔ مراد صرف یہ ہے کہ اگر یہ اولاد کی محرومی کسی ایسی خاتون کو ہے جو علم و فضل رکھتی ہیں اور علمی اور دینی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں تو پھر کیا ان کے لیے یہ بہتر نہیں کہ اپنے فرصت کے اوقات کو علم دین کی اشاعت کے کاموں پر صرف کریں۔ بجائے اس کے کہ ان ذمہ داریوں کو خود اپنے اوپر لادلیں جو خدا نے ان پر نہیں ڈالیں۔ انسان کا بچہ پالنا بڑی جانکاہی کا کام ہے۔ اردو میں ایک محاورہ ہے۔

''ایک جان گلے تو ایک لال پلے۔''

اب اگر تو یہ لال خدا نے دیا تو بے شک اس کی خاطر جان گلائیں، کیونکہ یہ ذِمّہ داری اللہ نے آپ پر ڈالی ہے۔ لیکن اگر اس نے نہیں ڈالی تو خود کیوں جان گلانے کا بندوبست کیا جائے، جبکہ دنیا میں بہت سے مفید کام صرف اس لیے نہیں ہو پاتے کہ انہیں کرنے والے موجود نہیں۔ اگر خدا نے اولاد سے محروم مگر علم و فضل رکھنے والی خواتین کو فرصت بہم پہنچائی ہے تو وہ اس فرصت کو معاشرے کے ایک بچے کی نذر کرنے کے بجائے کوئی ایسا کام کیوں نہ کریں جس سے معاشرے کے بیشمار بچے بھی اور بڑے بھی فائدہ حاصل کریں، ملک وملت کو تقویت حاصل ہو اور خود اُن کی اپنی زندگی اور آخرت دونوں سنور جائیں۔ خوش حال والدین کا بچہ لے کر پالنے سے اتنا تو ضرور ہو جاتا ہے کہ جذبہ مادری کی کچھ تسکین ہو جاتی ہے، انسان معاشرے کو غلط تاثر دے لیتا ہے کہ میں صاحب اولاد ہوں اور شاید یہ بچہ زندگی کی مشکلات میں کبھی کام بھی آجائے۔ مگر دوسری طرف اگر زندگی کی اس فرصت کو علمِ دین کی اشاعت پر صرف کیا جائے تو اور بہت سے پاک جذبات کو تسکین مل جاتی ہے اور معاشرے میں ایک بہت اچھا نمونہ قائم ہو جاتا ہے اور زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ برتر ہستی کافی ہو جاتی ہے جس کی خوشنودی کی تلاش میں یہ فرصت صرف کی گئی ہوتی ہے۔

اشاعت علم کے طریقے:۳

تحریر

اشاعت علم کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں میں تحریر کی اہلیت موجود ہے وہ قلم کو ذریعہ بنائیں۔ قلم بعض اوقات دوسرے ذرائع سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے کیونکہ تحریر کے ذریعے انسان بے شمار لوگوں سے مخاطب ہوسکتا ہے اور اپنے خیالات کو دُور دُور تک پھیلا سکتا ہے۔ یہ ذریعہ ان لوگوں کے لیے بہت زیادہ مفید ہے جن کے حالات انہیں گھروں سے زیادہ نکلنے اور مجمعوں کو مخاطب کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ویسے تحریر کو ذریعہ بنانا انہیں کے لیے مناسب ہے جن میں واقعی لکھنے کی صلاحیت موجود ہو اور اگر یہ بات نہ ہو تو خواہ مخواہ تکلف نہیں کرنا چاہیے اور علم کی اشاعت کے لیے کسی اور طریقے کو اختیار کر لینا چاہیے جس میں انسان بہتر طور پر کام کر سکے۔ مگر جن میں یہ صلاحیت موجود ہو وہ اگر اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کریں گے تو کوئی درست کام نہیں ہوگا۔ کیونکہ دوسرے طریقوں سے اشاعتِ علم کرنے والوں کے مقابلے میں لکھنے والے کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی میں یہ صلاحیت موجود ہے تو اسے اسی کو ذریعہ بنانا چاہیے۔

علامہ اقبالؒ کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے کہ زندگی میں ایک دفعہ انہوں نے یہ سوچا کہ شاعری چھوڑ کر خدمتِ قوم کا کوئی اور بہتر طریقہ اختیار کیا جائے خوش بختی سے اُن کے ایک عزیز دوست اور ایک محترم استاد دونوں نے اس رائے کی مخالفت کی اور انہیں یہ قدم اُٹھانے سے باز رکھا اور اسی میں ملت کی خوش قسمتی تھی۔ اپنی شاعری کے ذریعے انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی بے بہا خدمت انجام دی' لیکن اگر وہ اپنی اس خداداد صلاحیت سے منہ موڑ کر سیاست وغیرہ میں پڑ جاتے تو ظن غالب ہے کہ ملت کو ہرگز وہ فوائد نہ پہنچا سکتے جو انہوں

نے اپنے اشعار کے ذریعے پہنچائے' زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ سیاستدانوں کی فوج ظفر موج میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو جاتا تو اس سے آخر ملت کو کیا خاص فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی لکھنے والوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خالی صلاحیت کافی نہیں ہوتی۔ جنہوں نے تحریر کو اشاعتِ علم کا ذریعہ بنایا ہو' انہیں بھی اپنے علم کو بڑھاتے رہنے اور مسلسل مطالعہ کرتے رہنے کا التزام رکھنا چاہیے۔ ایک بالغ نظر نقاد نے کہا ہے کہ انسان کا تخیل ایک پرندہ ہے جو اُڑنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے مگر اس پرندے کو بلندیوں پر پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ مسلسل مطالعے کے ذریعے اسے غذا بہم پہنچائی جاتی رہے' ورنہ یہ زیادہ بلندیوں پر جانے کے قابل نہیں ہوگا' بس نیچے نیچے ایک خاص دائرے ہی میں چکر کاٹتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی تحریر کے ذریعے علم کی کوئی نمایاں خدمت انجام دینے کے لیے علم میں اضافہ کرتے رہنا ازبس ضروری ہے۔

تحریر کا کام مختلف شکلوں میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً با قاعدہ کتب بھی تصنیف کی جا سکتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بھی تیار کیے جا سکتے ہیں۔ اخبارات اور جرائد میں مضامین بھی لکھے جا سکتے ہیں' خطوط کے کالم میں خطوط بھی لکھ کر بھیجے جا سکتے ہیں اور نجی خطوں میں بھی علمی اور دینی معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ ہر انسان اپنی مخصوص صلاحیت اور وسائل و ذرائع کے لحاظ سے کوئی طریقہ چن سکتا ہے۔ ظاہر ہے با قاعدہ کتب تصنیف کرنے کے لیے بہت زیادہ مطالعہ' سخت قسم کی جانکاہی اور لمبی مدت کی ضرورت ہے۔ اگر کسی میں صلاحیت موجود ہے تو اسے صرف جانکاہی سے ڈر کر اس کام سے اعراض نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم اگر یہ ممکن نہ ہو تو مفید موضوعات پر پمفلٹ لکھنے یا رسائل و جرائد میں مضامین اور خطوط بھیجنے نسبتاً آسان کام ہے اور کم وقت اور محنت کا تقاضا کرتا ہے۔ جہاں تک نجی خطوط کو اشاعت کا ذریعہ بنانے کا معاملہ ہے' دردمند دل رکھنے والے لوگوں نے ان کے ذریعے بھی بڑی خدمت سر انجام دی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ آپ نے اکبر اور جہانگیر کا زمانہ پایا۔ اکبر نے اپنی جہالت اور حماقت کی بناء پر برصغیر میں جو الحاد کا

طوفان اٹھایا تھا' اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت مجدد صاحب نے جو کوششیں کیں' اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ آپ دربار کے روساء اور صاحب اقتدار ہستیوں کو نجی خطوط لکھتے جن میں تبلیغ دین کا حق ادا کرتے۔ ان خطوط میں سے صرف چند خطوط کے اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں دین کا درد ہوتا ہے وہ کس طرح ہر ممکن طریقہ سے اس کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

عہد اکبری کے مشہور جرنیل عبدالرحیم خانخاناں کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

"اے بھائی' جان لیجئے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ افسوس ہے اس شخص پر جس نے اس کھیتی میں کچھ نہ بویا' اپنی فطری صلاحیتوں کی زمین کو بے کار رہنے دیا اور اپنے اعمال کے بیج ضائع اور بے کار کر دیے اور زمین دو طریقے کی ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس میں کاشت ہی نہ کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اُس میں ناپاک اور خراب بیج ڈالا جائے اور ضیاع اور بربادی میں یہ دوسری قسم پہلی قسم سے زیادہ مضر اور فساد انگیز ہوتی ہے۔"

مراد یہ ہے کہ زندگی میں نیک اعمال نہ کرنا سخت خسارے کا سودا ہے' مگر برے عمل کرنا اور بھی زیادہ تباہ کن شے ہے۔

خانخاناں ہی کے نام ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

"ہمیں اپنی چند روزہ زندگی صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں گزارنی چاہیے۔ عذابِ آخرت سے بچنے اور ابدی نعمتوں سے ہمکنار ہونے کا انحصار اسی اتباع اور اطاعت پر ہے۔ پس مال و دولت اور مویشیوں کی زکوٰۃ پوری پوری ادا کرنی چاہیے اور بجز اطاعتِ رب اور کوئی مقصد نہ ہونا چاہیے۔"

اکبر کے رضاعی بھائی عزیز مرزا محمد کو' جو خان اعظم کہلاتا تھا اور جس نے اکبر کو الحاد سے روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ آپ کو احکامِ اسلامی کو سر بلند کرنے کی جدو جہد میں دشمنانِ اسلام پر نصرت عطا فرمائے۔ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اَلْاِسْلَامُ بَدَءَ غَرِیْبًا سَیَعُوْدُ

كَمَا بَدَءَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ (اسلام کا آغاز مسافرانہ بے کسی کے عالم میں ہوا اور پھر یہی مسافرانہ بے کسی اس پر طاری ہو جائے گی' سو مسافرت کے بیکسوں کو مژدۂ جانفزا ہو) اسلام کی غربت اور بے چارگی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ کفار برملا اسلام پر زبانِ طعن دراز کرتے اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں' احکامِ کفار کو بے دھڑک جاری کرتے ہیں اور مسلمان ہیں کہ انہیں اسلامی احکام جاری کرنے سے روکا جاتا ہے۔"

اسی خط میں آگے جا کر خانِ اعظم کو ہدایت دیتے ہیں کہ:

"آپ سے التماس ہے کہ اس بزرگ خانوادے کے اکابر کے ساتھ آپ کو جو محبت ہے اس کی برکت سے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام اور باتوں میں تاثیر بخشی ہے اور آپ کی دینی عظمت ہمعصروں کی نگاہ میں ظاہر ہو گئی ہے' یہ کوشش فرمائیں کہ اہلِ کفر کے وہ بڑے شعائر اور رسوم جو مسلمانوں میں رائج کر دیے گئے ہیں' مٹا دیے جائیں اور مسلمان ان منکرات سے محفوظ ہو جائیں۔"

اکبری امراء میں ایک شیخ فرید بخاری بھی تھے۔ انہوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کے لیے کوشش کی تھی۔ اس لیے جہانگیر نے اپنے عہد میں ان کا مرتبہ بہت بڑھا دیا تھا۔ شیخ فرید حمیت دین میں بہت گرمجوش تھے۔ اکبری عہد کی بے دینی اور الحاد کی لائی ہوئی گمراہیوں کو ختم کرنے کے لیے حضرت مجدد صاحب نے جو جدوجہد کی تھی' اس میں شیخ فرید نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ انہیں ایک خط میں مجدد صاحب فرماتے ہیں:

"اپنی ساری ہمت بلند اس کام میں لگا دیجئے کہ یہ سعادتِ عظمیٰ (یعنی ترویج شریعت اور احیائے ملت) حاصل ہو۔ اللہ سبحانہٗ کی عنایت سے آپ کو جاہ و جلال اور عظمت وشوکت سب کچھ حاصل ہے۔ اگر شرفِ ذاتی کے ساتھ یہ دولت (یعنی خدمت دین) بھی میسر آجائے تو گویا آپ میدانِ سعادت میں سب سے سبقت لے گئے۔"

اکبر نے اپنے عہد میں اسلام کا قلع قمع کرنے اور بے دینی پھیلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اکبر نے دین اسلام سے روگردانی کر کے ایک نیا دین ایجاد کر مارا تھا۔ اس نئے دین کے کچھ مخصوص اصول وعقائد تھے' جو فرنگیوں' پارسیوں اور ہندوؤں وغیرہ کے

عقائد سے اخذ کیے گئے تھے۔ اس دین کی عبادت صریح شرک پر مبنی تھی اور اس میں بادشاہ کو سجدہ جائز قرار دیا گیا تھا۔ بادشاہ کے اسلام دشمن ہونے کے باعث دشمنانِ اسلام اتنے دلیر ہو گئے تھے کہ کھلم کھلا اسلامی عقائد و تعلیمات کا مضحکہ اڑانے لگے تھے اور مسلمانوں کے لیے عرصہِ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ مگر خدا کی مہربانی سے یہ صورتِ حالات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ نئے دین کے پرجوش حامی اکبر کی زندگی ہی میں مر گئے تھے اور دربار میں جو اسلام پسند امراء تھے۔ انہوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کی حمایت اس شرط پر کی تھی کہ جہانگیر برسرِ اقتدار آ کر اکبری دین کا قلع قمع کرے گا اور شریعت اسلامی کو نافذ کرے گا۔ جہانگیر نے اس عہد کو اس طرح نبھایا کہ اکبری دین کی حوصلہ افزائی نہ کی' یہ دین اپنی موت آپ مر گیا' مگر اس کے باعث ملک وملت کی اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں پھیل چکی تھیں' وہ موجود تھیں۔ حضرت مجدد صاحب ان برے اثرات کو مٹانا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں:

''عہد ماضی میں جو کفر کی رسمیں پیدا ہو گئی تھیں اُن کا آج جبکہ اہلِ کفر کی طرف بادشاہ اسلام (یعنی جہانگیر) کا وہ رجحان نہیں رہا' باقی رہنا مسلمانوں کے دلوں پر بہت گراں ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ بادشاہ اسلام کو ان بدکیشوں کی رسموں کی برائی سے آگاہ کریں اور اُن کو مٹانے کی کوشش کریں۔''

ان اقتباسات کو پیش کرنے سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ نجی خطوط بھی علمِ دین کو پھیلانے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتے ہیں' بشرطیکہ لکھنے والے کے دل میں دین کا صحیح درد موجود ہو اور دین کے اصول و عقائد سے واقفیت حاصل ہو۔



اشاعتِ علم کے طریقے:۴

کچھ اور طریقے

تدریس، تحریر اور دینی اجتماعات کو ذریعہ اشاعتِ علم بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ علم ایک خاص سطح تک، ضرور پہنچا ہوا ہو، ورنہ یہ کام صحیح طریقے سے انجام نہیں پاسکتے۔ تاہم جن لوگوں کے پاس اتنا علم نہ ہو، اشاعتِ علم کا دروازہ اُن کے لیے بھی بند نہیں۔ کسی مفید چیز کو پھیلانے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان خُود اسے پھیلانے کے لیے کوشاں ہوں اور دوسرا یہ کہ جو اسے پھیلا رہے ہوں اُن کی امداد کی جائے۔ اس لیے جو لوگ خود اس قابل نہ ہوں کہ درس و تدریس کرسکیں یا قلم کو ذریعہ بنا سکیں، اُن کے لیے اشاعتِ علم میں حصہ لینے کا ایک مفید طریقہ یہ ہے کہ جو ادارے یا افراد اشاعت علم کے کام میں مصروف ہوں اُنہیں بہم پہنچائیں۔

☆ **مالی امداد:** بسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ دردمند دل رکھنے والے لوگ اشاعت علم دین کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں، مگر مالی وسائل کی کمی انہیں ایک خاص حد سے آگے نہیں جانے دیتی۔ ایسی صورت میں انہیں مالی امداد بہم پہنچا کر اس قابل بنانا کہ وہ اشاعت علم کا کام زیادہ کرسکیں، گویا خود اشاعت علم کرنا ہے۔ جو لوگ صاحب ثروت ہیں۔ مگر صاحب علم نہیں، انہیں تو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اس کی اشاعت میں وہ اسی طرح مددگار ہوں جس طرح وہ لوگ ہیں جنہیں وہ حاصل ہے۔ باقی رہے وہ صاحب ثروت جو صاحب علم بھی ہیں تو انہیں بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت کے بارے میں سوال کرنا ہے

کہ اسے کہاں صرف کیا گیا' اسی لیے اُنہیں اپنے علم کے علاوہ اپنی ثروت کو بھی مفید راہوں پر صرف کر کے اس سوال کے جواب کی تیاری کر لینی چاہیے۔

ایسے ہی اشاعت علم کا ایک ذریعہ لوگوں کو

☆ مفید کتب بہم پہنچانا: بھی ہے۔ اچھی کتاب اسی لیے لکھی جاتی ہے اور اچھے رسائل اسی لیے جاری کیے جاتے ہیں کہ لوگوں میں علم دین زیادہ سے زیادہ پھیلے۔ لکھنے والوں نے تو لکھ کر اپنے حصے کی خدمت سرانجام دی۔ اب جو اُنہیں لوگوں تک پہنچانے اور اُن کی تعلیمات کو پھیلانے کا کام کریں گے۔ وہ بھی اسی طرح اشاعتِ علم کا فریضہ ادا کر رہے ہوں گے جیسے لکھنے والوں نے کیا ہوگا۔ ایسے ہی اچھے رسائل اور جرائد کی اشاعت بڑھانے کی کوشش کرنا بھی گویا خود علم کی اشاعت کرنا ہے۔ جتنی کسی رسالے کی اشاعت زیادہ ہوگی' اتنا ہی وہ مالی طور پر مضبوط ہوگا اور اس کا پیغام دُور دُور تک پہنچے گا۔

اچھی کتب پھیلانے کے لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو یہ کتابیں تحفے کے طور پر دی جائیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر پڑھنے کے لیے عاریۃً دی جائیں اور اس کے بعد واپس لے کر کسی اور کو بہم پہنچا دی جائیں۔ اس طرح ایک نسخہ زیادہ لوگوں کے زیر مطالعہ آسکے گا۔ کتب دیتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ جنہیں کتابیں دی جا رہی ہیں' وہ مطالعے کا شوق رکھتے ہوں۔ کیونکہ جن کو مطالعے کا شوق نہ ہوگا' وہ تو کتاب لے کر ایک طرف ڈال دیں گے اور شاید ہی اسے پڑھیں گے۔ البتہ جو مطالعے کا شوق رکھتے ہوں گے' اُن سے توقع ہے کہ اپنی عادت کے باعث وہ اسے پڑھ لیں گے۔

یہ لوگ اگر دین کی طرف مائل نہ بھی ہوں تو بھی انہیں ایسی کتب ضرور دی جائیں بلکہ زیادہ دھیان سے دی جائیں کیونکہ اگر وہ متاثر ہو گئے تو پھر انہیں ایسی کتب کی مزید طلب پیدا ہو جائے گی اور یہ مطالعہ عجب نہیں کہ آخر کار انہیں پورے طور پر دین کی طرف

راغب کر دے۔ باقی رہے وہ لوگ جو پہلے ہی دین کی طرف مائل ہوتے ہیں تو انہیں بھی ایسی کتب ضرور دی جائیں' کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں دین سے محبت تو ہوتی ہے مگر پوری واقفیت نہیں ہوتی۔ یہ کتب اُن میں واقفیت بہم پہنچا کر ان کی محبت کو زیادہ پائیدار بنیادوں پر قائم کریں گی۔

اشاعت علم دین کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنی

☆ عام گفتگو: میں اس بات کا دھیان رکھا جائے کہ وہ دینی لحاظ سے معلومات افزا ہو۔

عام گفتگو کا دینی لحاظ سے معلومات افزا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہر وقت وعظ و نصیحت ہی کرتا رہے۔ تبلیغ کے ساتھ ایک شے حکمت تبلیغ بھی ہے یعنی دانائی سے تبلیغ کرنا اور مسلسل وعظ و نصیحت و کرنا' جس سے سننے والے اُکتا جائیں' حکمت تبلیغ کے خلاف ہے۔

ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے تو اُن سے ایک شخص نے کہا اے ابو عبدالرحمٰن میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں ہر روز وعظ سنایا کریں۔ اس پر حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ (روز روز کے وعظ سے) مجھے صرف یہ امر مانع ہے کہ تم لوگ رنجیدہ نہ ہو جاؤ (یعنی اُکتا نہ جاؤ) میں اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت کرتا ہوں جیسے حضورؐ ہمیں ناغہ کر کے نصیحت کرتے تھے' اس خوف کے باعث کہ کہیں ہم (زیادہ نصیحتیں سن سن کر) بے زار نہ ہو جائیں۔ (بخاری)

گفتگو کا دینی لحاظ سے معلومات افزا ہونا یہ ہے کہ موقع موقع سے ایسی بات ہو جائے جس سے سننے والے کو خدا یا خدا کے رسولؐ کے کسی فرمان کا علم ہو جائے۔ بغیر اس کے کہ اُسے احساس ہو کہ اسے وعظ و تلقین کی جا رہی ہے۔ پھر جن لوگوں سے اکثر ملاقات ہوتی رہے اُن کے کانوں میں کبھی کبھی بھی کوئی فرمان ڈالا جاتا رہے گا' تو ایک مدت کے بعد وہ کافی فرامین سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ ایسے ہی اگر کسی معاملے میں کوئی سند پیش کرنی

ہوتو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ یا دوسرے صلحائے عظام کے اعمال کو بطور سند پیش کیا جائے۔ اس طرح سننے والوں کو ان بزرگ ہستیوں کے اعمال وحالات سے واقفیت ہوجائے گی، بغیر اس کے کہ انہوں نے واقفیت حاصل کرنے کے لیے کوئی شعوری کوشش کی ہو۔ اسی طرح جب کسی غمزدہ کو تسلی دلاسا دیا جارہا ہو تو پیغمبرانِ عظام اور بزرگان دین پر آنے والے مصائب اور اُن کے مقابلے میں ان کے صبر وتحمل کا حال بتایا جائے اور وہ آیات واحادیث سنای جائیں جن میں صبر وتحمل کی فضیلت کا بیان ہے۔

غرضکہ کئی مواقع ایسے آسکتے ہیں جب کہ دینی لحاظ سے معلومات افزا گفتگو کر کے مخاطبین کو علم بہم پہنچایا جاسکتا ہے بغیر اس کے کہ اُن کے ذہن ودماغ پر کوئی بوجھ پڑے۔

اپنی گفتگو کو دینی لحاظ سے معلومات افزا بنانے کے لیے اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ اپنا علم ایک خاص درجے تک ضرور پہنچا ہوا ہو اور مطالعے کی عادت قائم رہے۔

آخر میں اس بات پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ ان سب کاموں کے لیے بھی وقت لازماً درکار ہوتا ہے اور وہ کہاں سے آئے، تو حصولِ علم کی طرح اشاعتِ علم کے معاملے میں بھی ان گزارشات پر غور کر لینا مفید ہوگا جو وقت کے معاملے میں پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔



علم پر عمل

زمانہ قدیم سے تعلق رکھنے والی حکایات میں سے ایک حکایت بیان ہوئی ہے کہ ایک شہزادہ اپنے استاد سے سبق پڑھ رہا تھا۔ اُستاد نے اُسے دو جملے پڑھائے۔۔

''جھوٹ نہ بولو' غصہ نہ کرو۔''

کچھ دیر بعد جب شہزادے سے سبق سنانے کو کہا گیا تو اس نے جواب دیا کہ سبق ابھی یاد نہیں ہوا۔ وہ دن تو گزر گیا۔ دوسرے دن پھر جب استاد نے سبق سنانے کو کہا تو شہزادے نے دوبارہ وہی جواب دیا کہ سبق ابھی یاد نہیں ہوا۔ استاد کو غصہ آیا مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ تیسرا دن آ گیا۔ پھر اُستاد نے کہا کہ سبق سناؤ' تو شہزادے نے پھر وہی بات دہرادی کہ ابھی سبق یاد نہیں ہو سکا۔ اب تو استاد اس قدر غضبناک ہوا کہ اس نے طیش میں آ کر شہزادے کو زور کا تھپڑ رسید کیا کہ یہ کوئی بات ہے کہ دو چھوٹے چھوٹے جملے تین دن میں بھی یاد نہیں ہو سکے۔ تھپڑ کھا کر شہزادہ چند منٹ خاموش بیٹھا رہا اور پھر استاد سے کہنے لگا کہ اب سبق سن لیجئے' مجھے یاد ہو گیا ہے۔ استاد کو اس حرکت پر بہت تعجب ہوا کہ جو سبق تین دن سے یاد نہیں ہو رہا تھا' وہ تھپڑ کھاتے ہی کیسے یاد ہو گیا۔ جب شہزادے سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ آپ نے مجھے دو باتیں پڑھائی تھیں' ایک ''جھوٹ نہ بولو''، اور دوسرے ''غصہ نہ کرو۔'' جھوٹ بولنا تو میں نے اسی دن چھوڑ دیا تھا' مگر ''غصہ نہ کرو''

بہت مشکل چیز تھا۔ بہت کوشش کرتا رہا کہ غصہ نہ آئے مگر غصہ آجاتا تھا۔ اب جب تک میں غصے پر قابو نہ پالیتا آپ سے کیسے کہتا کہ سبق یاد ہو گیا ہے۔ آج جب آپ نے مجھے تھپڑ مارا تو میں نے غور کیا کہ مجھے غصہ آیا ہے یا نہیں' تو مجھے محسوس ہوا کہ تین دن کی کش مکش کے بعد اب میں نے غصے پر قابو پالیا ہے کیونکہ آپ سے تھپڑ کھا کر مجھے بالکل غصہ نہیں آیا تھا۔ اس لیے میں نے آپ کو بتادیا کہ سبق یاد ہو گیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ جو علم حاصل کیا جاتا ہے اس کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس پر عمل ہو' ورنہ اس کی حیثیت اس بیج کی سی ہوتی ہے جسے بو تو دیا جائے مگر اس سے کوئی پودا یا درخت پیدا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں حاصل کردہ علم پر عمل کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

☆عمل کی تاکید: ایک دفعہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت کعبؓ سے پوچھا کہ اہلِ علم کون لوگ ہیں۔ حضرت کعبؓ نے جواب دیا کہ وہ جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔

(مشکوٰۃ بحوالہ دارمی)

حضرت ابراہیم خواص کا فرمان ہے کہ "علم تو اسی شخص کا ہے جو علم کا اتباع کرے اور اس پر عمل کرے اور سنت کی پیروی کرے' اگرچہ وہ تھوڑا علم رکھتا ہو۔"

اس کے برعکس ایسے لوگ بھی دیکھے جاتے ہیں جو علمی اور دینی مجالس میں شرکت کرتے اور جو کچھ وہاں سنتے ہیں اس سے بہت زیادہ متاثر ہونے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر بات صرف متاثر ہونے کی حد تک ہی رہ جاتی ہے اس سے آگے بڑھ کر عمل کی حدود میں داخل نہیں ہوتی۔ علامہ ابن جوزیؒ اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں ایسے لوگوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں ذاتی طور پر بہت سے آدمیوں کو جانتا ہوں جو سالہا سال سے مجلس وعظ

میں شریک ہوتے ہیں اور (جو کچھ ان مجالس میں سنتے ہیں اس پر) روتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں، لیکن نہ سود لینا چھوڑتے ہیں، نہ تجارت میں دھوکا دینے سے باز آتے ہیں، ارکانِ صلوٰۃ سے جیسے وہ برسوں پہلے بے خبر تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ مسلمانوں کی غیبت، والدین کی نافرمانی میں جیسے پہلے مبتلا تھے اُسی طرح اب بھی مبتلا ہیں۔ شیطان نے اُن کو یہ جل دے رکھا ہے کہ مجلس وعظ کی حاضری اور گریہ و بکا (ہی) ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔"

کئی ایسی خواتین کو ملنے کا اتفاق ہوا جو سالہا سال سے باقاعدگی سے مسجد میں جاتیں اور قرآن و حدیث کا درس سنتی تھیں، مگر اس کے باوجود غیبت کرنے اور بہتان لگانے اور سنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے چلا دینے سے ذرا نہیں ڈرتی تھیں۔ امام غزالیؒ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "احیاء علوم الدین" میں مجلس وعظ و نصیحت میں شرکت کرنے مگر جو کچھ سنا ہو اس پر عمل نہ کرنے والوں پر بڑی سخت تنقید کی ہے۔ ان کی رائے میں جو شخص اس طرح دین کا علم حاصل کرتا ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا۔

"اس کی مثال اس مریض کی سی ہے جو کسی طبیب کے مطب میں بیٹھتا ہے اور نسخے سنتا رہتا ہے لیکن اس سے اس کو صحت نہیں ہو سکتی، یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع و اقسام کی فہرست سنتا ہے اس سے اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔"

اس فرمان کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ علم حاصل کر لینا یا وعظ و نصیحت کی باتیں سن لینا اس وقت تک پورے طور پر فائدہ مند نہیں ہو سکتا جب تک حاصل کردہ علم اور سنے ہوئے وعظ و نصیحت پر عمل نہ کیا جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے فرمایا کہ "میں تمہیں حکمت کی تعلیم اس لیے نہیں دیتا کہ بیٹھ کر اس پر تعجب کیا کرو بلکہ اس لیے دیتا ہوں کہ اس پر عمل کرو۔"

حضرت ابوبکرؓ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس بات پر راضی نہیں کہ وہ اطاعت کا زبانی اقرار کرلیں بلکہ وہ تو عملی اطاعت چاہتا ہے۔"

ایسے ہی حضرت علیؓ مومن کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "علم اس کا دوست، عمل اس کی وزیر، صبر اس کی فوجوں کا سپہ سالار اور عمل منتظم ہے۔"

سلف صالحین نے علم کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام میں حاصل کردہ علم پر عمل کرنا ازحد ضروری قرار دیا گیا ہے۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

"لوگوں کو ان کے افعال سے پرکھو نہ کہ اقوال سے۔ خدا نے کوئی ایسا قول نہیں چھوڑا جس کی تصدیق یا تکذیب کے لیے کوئی نہ کوئی عمل نہ ہو۔ کسی کی میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکا نہ کھاؤ بلکہ یہ دیکھو کہ فعل کیسا ہے۔"

آپ ہی کا مقولہ ہے۔ "اے آدمؑ کے بیٹے' یہ تیری تمام حکمت و دانائی کس کام کی جبکہ تیرا عمل احمقانہ ہے۔"

نیز فرماتے ہیں۔ "جو علم میں سب سے آگے نکل گیا۔ اسے عمل میں بھی سب سے آگے ہونا چاہیے۔"

آپ ہی کا فرمان ہے۔ "قیامت میں سب سے زیادہ حسرت دو شخصوں کو ہوگی۔ ایک اُسے جو اپنا مال دوسرے کی میزان میں دیکھے گا' جس سے وہ دوسرا تو خوش بختی حاصل کرے گا اور یہ بدبختی۔ اور دوسرے اسے جو اپنا علم دوسرے کے ترازو میں دیکھے گا' جس سے اُسے تو سعادت ملے گی اور اسے شقاوت۔"

علم کے دوسرے کے ترازو میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے علم حاصل کر کے اُس دوسرے نے عمل کیا اور اپنا انجام بخیر کرلیا۔ مگر اس نے اپنے علم پر عمل نہ کیا اور

بے نصیب رہا۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں۔ ’’علم عمل کو پکارتا رہتا ہے‘ جواب نہیں پاتا‘ تو رخصت ہو جاتا ہے۔

حضرت مالک بن دینارؒ کا فرمان ہے کہ ’’بے عمل عالم کی نصیحت دلوں پر وہی اثر کرتی ہے جو بارش سنگلاخ چٹان پر۔‘‘ ظاہر ہے بارش سنگلاخ چٹان پر اثر نہیں کرتی ایسے ہی بے عمل عالم کی نصیحت کا بھی سننے والے کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ ’’اے علم والو! اپنے علم پر عمل کرو‘ کیونکہ عالم وہی ہے جو علم حاصل کر کے عمل کرتا ہے اور جس کے علم و عمل میں اختلاف نہیں ہوتا۔ جلد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو علم تو رکھیں گے مگر علم ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔ ان کا باطن اُن کے ظاہر سے مختلف ہوگا۔ اُن کے عمل کے خلاف رہے گا۔‘‘

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں۔ ’’علم کے بغیر عمل بے کار ہے اور عمل کے بغیر علم بے کار ہے۔‘‘

ابو محمد سفیان بن عینیہؒ کا قول ہے۔ ’’تمہارے لیے ایسے علم سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں جس پر تم عمل نہیں کرتے۔‘‘

حضرت شعبیؒ بیان کرتے ہیں کہ قیامت میں حساب کتاب کے بعد جنتی لوگ بعض دوزخیوں کو دیکھ کر تعجب کریں گے اور پوچھیں گے کہ تم لوگ یہاں (دوزخ میں) کیسے آ گئے۔ تمہارے ہی سمجھانے بجھانے اور نصیحت کرنے کے باعث تو ہم جنت میں پہنچے ہیں۔ اس پر دوزخی جواب دیں گے کہ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ ہم تمہیں تو سمجھاتے تھے‘ نصیحت کرتے تھے مگر خود عمل نہیں کرتے تھے (یہی وجہ ہے کہ تم تو ہمارے باعث جنت میں چلے گئے مگر ہم خود دوزخ کے حقدار ٹھہرے)۔

حضرت ابوالاسود دؤلی نے بے عمل عالم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''تم بیماروں کے لیے شفا کے نسخے تجویز کرتے ہو حالانکہ تم خود ہی بیمار ہو۔ تم ہماری عقلوں میں نصیحتوں کے جوڑ لگاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم خود ہدایت سے محروم ہو۔''

حضرت ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن آدمؑ کے بیٹے کے پاؤں اس وقت تک سرک نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہیں کر لیا جائے گا۔

۱۔ اس کی عمر کے بارے میں کہ اُسے نے اُس کن کاموں میں صرف کیا۔

۲۔ اس کی جوانی کے بارے میں کہ اُس نے اُسے کن مشاغل میں پرانا کیا۔

۳، ۴۔ اس کے مال کے بارے میں کہ اس نے اسے کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن مصارف پر صرف کیا۔

۵۔ اور اس بات کے بارے میں کہ جو علم اس نے حاصل کیا اس پر کہاں تک عمل کیا۔

(ترمذی)

حضرت سفیان ثوریؒ کی والدہ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''تمہارا علم تمہارے اخلاق کو سنوارنے کا ذریعہ ہو نہ کہ بگاڑنے کا، عبادت کے لیے ہو نہ کہ تجارت کے لیے، دوست ہو نہ کہ دشمن۔''

ایک دفعہ انہوں نے فرمایا کہ ''بیٹے جب تم دس حرف لکھ چکو تو دیکھو کہ تمہارے طور طریقوں اور علم و وقار میں کچھ ترقی ہوئی ہے کہ نہیں۔ اگر ترقی نہیں ہوئی تو جان لو کہ تم نے اپنے علم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔''

حضرت ابراہیم خواص فرماتے ہیں۔ ''علم تو اسی شخص کا ہے جو علم کا اتباع کرے اور اس پر عمل کرے اور سنت کی پیروی کرے۔ اگرچہ عرفی اور رسمی طور پر وہ شخص کم علم ہی ہو۔''

یہ تمام بیانات واضح کیے دیتے ہیں کہ علم کے ساتھ عمل ازحد ضروری ہے۔ تاریخ میں عمل کے بارے میں ایسے واقعات بھی آئے ہیں جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے علم حدیث کے شوق میں دُور دراز کے سفر کیے تھے۔ پھر انہوں نے احادیث کی ایک کتاب تالیف کی جو بہت ضخیم ہے۔ آپ کا فرمان ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو حدیث بھی لکھی ہے اس پر عمل ضرور کیا ہے۔ حد یہ کہ کتاب میں ایک حدیث رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنا لگوانے کے بارے میں ہے کہ حضورؐ نے حجام سے پچھنا لگوایا اور اس کو ایک دینار دیا۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث پر بھی عمل کر لیا یعنی حجام سے پچھنا لگوانا اور اس کو ایک دینار دیا۔ ان کے بیان سے محسوس ہوا ہے کہ انہیں پچھنا لگوانے کی ضرورت نہیں تھی، مگر چونکہ انہوں نے اپنے اُوپر اس بات کو لازم قرار دے لیا تھا کہ اپنی کتاب کی ہر حدیث پر عمل ضرور کریں گے، اس لیے اس حدیث پر عمل کرنے کے لیے پچھنا لگوایا اور حضورؐ ہی کی طرح حجام کو ایک دینار بھی دیا۔

ایسے ہی حضرت زینبؓ بنت جحش کے بارے میں روایت ہے کہ اُن کے کسی قریبی عزیز کی وفات ہوگئی۔ تین دن گزر گئے تو انہوں نے خوشبو لگائی اور فرمایا کہ مجھے خوشبو لگانے کی حاجت نہیں تھی۔ میں نے یہ خوشبو صرف اس لئے لگائی ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ کسی مسلمان عورت کو شوہر کے سوا کسی اور کے لیے تین دن سے زیادہ سوگ منانا جائز نہیں۔۔۔ مراد یہ تھی کہ میرا خوشبو لگانا اس بات کا اعلان ہے کہ حضورؐ کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے میں نے سوگ ختم کر دیا ہے۔

جہاں تک صحابہ کرامؓ کا تعلق ہے وہ بزرگ تو تھے ہی سراپا عمل، مگر بعد میں آنے والے سلف صالحین نے بھی ہمیشہ عمل کی تاکید فرمائی ہے۔ سید علی ہجویریؒ کا فرمان ہے۔ ''علم پڑھ، علم سیکھ اور عمل کر۔''

نافع علم

آخر میں علم کے بارے میں ایک خاص نکتہ ذہن نشین کر لینا مفید ہوگا اور وہ یہ ہے کہ علم کی تو کوئی انتہا نہیں۔ بے شمار علوم اپنی تفصیلات کے ساتھ وجود میں آ چکے ہیں۔ مگر انسانی زندگی اس کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے۔ اس لیے علم حاصل کرتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس مختصر سی مدت میں حصولِ علم کے لیے جو وقت ملے وہ اس علم پر صرف ہو جو زیادہ سے زیادہ نافع ہو۔ ایسے نہ ہو کہ وقت اور محنت تو صرف ہوتی رہے، مگر اس کے عوض جو کچھ حاصل کیا جائے اسے رواجِ عام کے مطابق تو علم کہا جاتا ہو مگر درحقیقت وہ دنیا اور آخرت دونوں میں محض بے فائدہ ثابت ہونے والا ہو۔ یا اگر کچھ فائدہ پہنچائے بھی تو وہ فائدہ اتنا کم ہو کہ اگر اس وقت اور طاقت کو جو اس کے حصول پر صرف کیا گیا تھا کسی اور جگہ صرف کیا گیا ہوتا تو نسبتاً بہت زیادہ نتائج پیدا ہوتے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے علم کا نافع ہونا یہ ہے کہ وہ صحیح مفید اور کامیاب زندگی گزارنے اور آخرت کی بخشش اور درجات کی بلندی حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ جو علم یہ نتائج پیدا کرے وہ ''نافع'' ہے۔ جو علم یہ نتائج پیدا نہ کرے وہ ''بے فائدہ'' ہے اور جو علم اس کے برعکس نتائج پیدا کرے وہ ''مضر'' ہے۔

ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ کسی بچے کو لچر ناول اور اخلاق کو خراب کرنے

والی کتابیں پڑنے کی عادت پڑگئی۔ باپ نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بچہ اپنی نصاب کی کتابوں کی طرف قطعی توجہ نہ دیتا اور سارا وقت فضول کتابیں پڑھنے پر صرف کر دیتا۔ ایک دن اس کے باپ نے اسے ایک خوبصورت بستہ لا کر دیا اور ہدایت کی کہ اپنی کتابیں اس میں رکھا کرو تا کہ محفوظ رہیں۔ بچہ بستہ پا کر بہت خوش ہوا' مگر کتابیں رکھتے ہوئے بھی اس نے پہلے اس میں اپنی فضول اور بے فائدہ کتابیں ہی ڈالیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بستہ انہیں کتابوں سے بھر گیا اور نصاب کی کتابیں رکھنے کے لیے اس میں کوئی جگہ نہ رہی۔ اب باپ نے اسے سمجھایا کہ دیکھو یہی حال تمہاری زندگی کے اوقات اور تمہارے ذہن اور حافظے کا ہے۔ اگر تم اپنے اوقات کو بے فائدہ اور مضر کتابیں پڑھنے پر صرف کرتے رہو گے اور اپنے ذہن اور حافظے کو بے فائدہ اور مضر معلومات سے بھرتے رہو گے تو مفید اور نفع بخش کتابیں پڑھنے کے لیے کوئی وقت نہیں بچے گا اور مفید اور نفع بخش معلومات کے لیے تمہارے ذہن اور حافظے میں کوئی جگہ نہیں رہے گی۔

لہٰذا علم حاصل کرتے ہوئے بھی بڑی سمجھداری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ زندگی چندروزہ ہے مگر اس کے دوران انسان نے جو اعمال وافعال انجام دینے ہیں وہ یا تو اسے دائمی راحت و کامیابی عطا کر دیں گے یا پھر اسے دائمی عذاب و اذیت میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔ یہی حقیقت ہے جس نے اس چندروزہ زندگی کی اہمیت کو بے انتہا بڑھا دیا ہے اور انسان کی عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس مختصر سی مدت کے کسی لمحے کو بھی مضر یا بے فائدہ کام پر صرف کرنے کا روادار نہ ہو۔ علم حاصل کرتے وقت بھی اس شے کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اپنے میلانِ طبع اور صلاحیتوں کی روشنی میں اس علم یا علوم کا انتخاب کیا جائے جو زندگی اور آخرت دونوں جگہ نفع بخش ثابت ہونے والے ہوں۔ کیونکہ محض علم حاصل کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ "نافع علم" حاصل کرنا مقصود ہے۔ علوم تو دنیا میں بے شمار ہیں

مگر وہ سبھی مفید نہیں ہوتے بلکہ بعض سخت مضر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جادو بھی بہر حال ایک علم ہی ہے مگر اس کی مضرت کے پیش نظر اسلام نے اسے بالکلیہ حرام قرار دے دیا ہے۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں کہ بے فائدے اور مضر علوم سے بچا جائے بلکہ مفید علوم میں سے بھی مفید تر چننے کی ضرورت ہے۔ وجہ وہی ہے کہ زندگی کی مہلت تھوڑی ہے اور چونکہ یہ تھوڑی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے دوران زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی سعی جاری رہے۔ اس میں اتنی گنجائش ہی نہیں کہ مضر یا بے فائدہ کاموں پر وقت صرف کیا جائے۔

پھر کسی علم کو حاصل کرتے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان ان مصنفین کی کتب کو زیر مطالعہ رکھا جائے جو اس علم میں گہری نگاہ رکھتے ہوں۔ کیونکہ ہر علم اب اتنا پھیل چکا ہے اور اس کے بارے میں اتنی زیادہ کتابیں تصنیف اور تالیف ہو چکی ہیں کہ کسی علم سے تعلق رکھنے والے سبھی مصنفین کی کتب کو پڑھنا عموماً ممکن نہیں ہوتا اور جو وقت اور محنت صرف کر کے اعلیٰ پائے کی کتب پڑھی جا سکتی ہوں، اسے ایسی کتب کو پڑھنے پر صرف کرنا جو نسبتاً کم درجے کی ہوں، اپنے قیمتی وقت کے ایک حصے کو ضائع کرنا ہے۔ حاصل کیے جانے والے علم سے زیادہ سے زیادہ ائدہ اٹھانا ایک حد تک اس بات پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ نے اس خاص علم سے تعلق رکھنے والے کن مصنفین کی کون کون سی کتابوں کو زیر مطالعہ رکھنا ہے۔ اس سلسلے میں اس علم سے تعلق رکھنے والے اور اس میں نگاہ رکھنے والے لوگوں سے مشورہ کرتے رہنا عموماً بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

جو کچھ ان اوراق میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وفادار اور باصلاحیت نائب بننے کے لیے۔

۱۔ حصولِ علم کے لیے کماحقہ' کوشش کرتے رہیں۔

۲۔ جو علم حاصل کریں اس پر خود عمل کرنے کی پوری سعی کرتے رہیں۔

۳۔ علم کو صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھیں بلکہ امکان کی حد تک اس کی اشاعت کے لیے بھی کوشاں رہیں۔

۴۔ نافع اور غیر نافع علم اور کم نافع اور زیادہ نافع علم میں تمیز کرتے ہوئے اپنے اوقات اور قوتوں کو اسی علم پر صرف کریں جو زیادہ نافع ہو۔

۵۔ اور سب سے زیادہ ضروری یہ کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں کہ وہ جو علم بھی ہمیں عطا فرمائے' اُسے ہمارے لیے نفع بخش بنائے۔ کیونکہ بڑے بڑے ''علم والے'' ایسے دیکھے گئے ہیں جن کے علم نے نہ انہیں علم عطا کیا ہے' نہ وقار' نہ خلوص' نہ تقویٰ' نہ وسعت نگاہ' نہ سیر چشمی' نہ انکسار' نہ حق گوئی' نہ خدا کی معرفت' نہ اپنی پہچان' نہ اپنے انجام کا خوف۔

اب ان معروضات کو ہم اس دعا پر ختم کرتے ہیں جو جامع ترمذی اور بعض دوسری احادیث میں بیان ہوئی ہے اور جو اس پائے کی ہے کہ زبان اس کی کماحقہ' تعریف کرنے سے عاجز ہے اور جو اس لائق ہے کہ ہر طالب علم اسے اپنا وظیفہ بنائے رکھے۔ وہ دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا یَنْفَعُنِیْ۔

(اے خدا مجھے نفع دے اس علم سے جو تو نے مجھے عطا کیا اور عطا کر مجھے وہ علم جو مجھے نفع دے)



